آغا گل کا فنی و فکری مطالعہ
فضل الرحمٰن تنہا آغر شین
گُل شناسی
مہردر
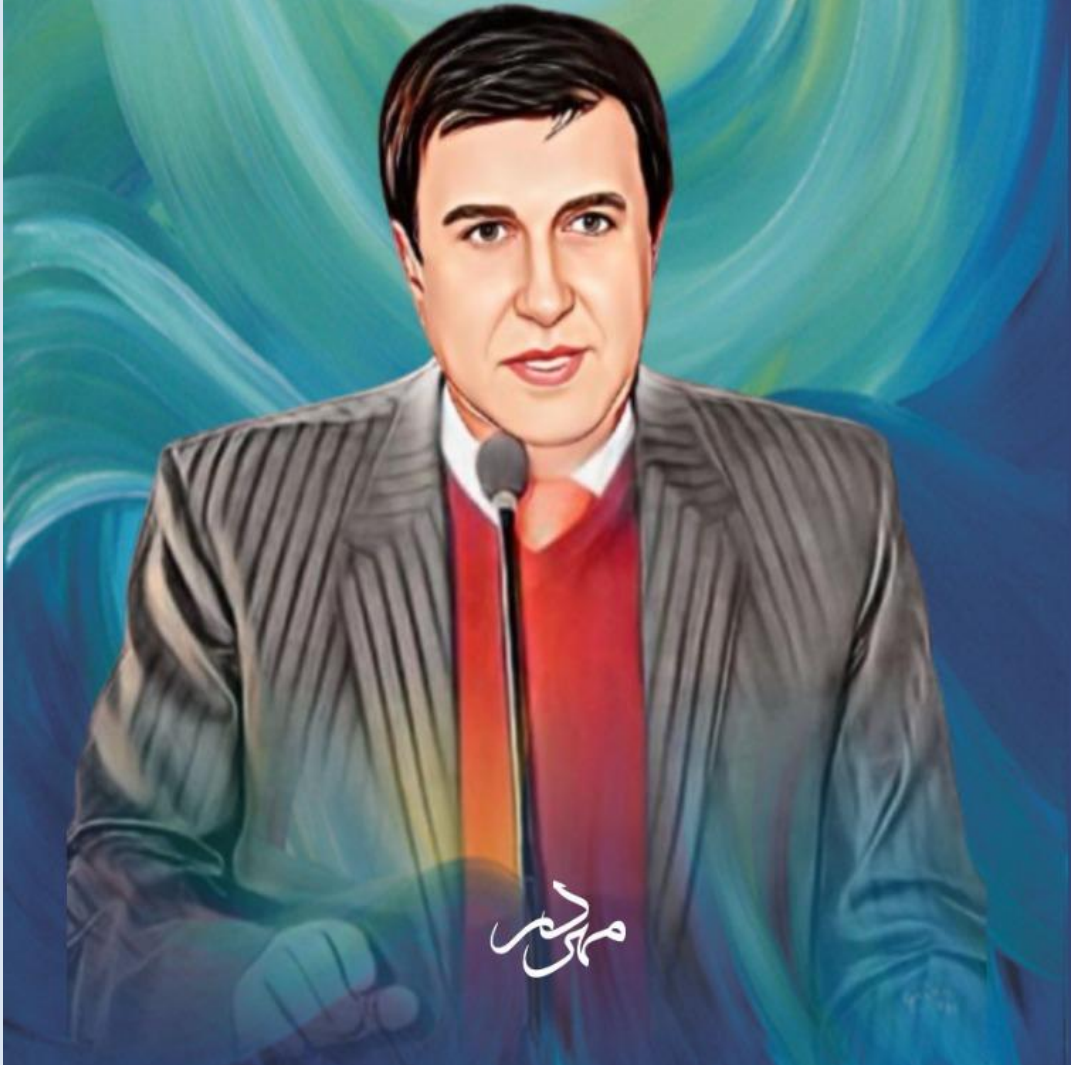
گل شناسی

آغا گل کا فکری و فنی محاکمہ

فضل الرحمٰن تنہا آغر شین

لکچرار اردو، گورنمنٹ بوائز ڈگری کالج پشین

مہردر

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں!

آغا گل شناسی

(تحقیق و تنقید)

فضل الرحمٰن تنہاؔ

پہلی ڈیجیٹل اشاعت:2025ء

قیمت:500روپے

ٹائٹل ڈیزائننگ:

منصور بلوچ

تزئین و آرائش:

Urdueditor@gmail.com

ISBAN: 978-627-7875-08-04

مہردر

ریسرچ اینڈ پبلی کیشن، کوئٹہ

Mehrdar22@gmail.com

0333-7832322

افلا یتفکرون

ایلیاہ ایلیاہ لما شبقتنی

اے خدا، اے خدا! تو نے مجھے اکیلا کیوں چھوڑ دیا؟

من از گل باغ می جویم تو گل از باغ می جوئی

من آتش از دخان بینم تو از آتش دخان بینی

عرفی شیرازیؒ

فضل تنہا غرشین اور ان کا بیٹا جون ایلیا، آغا انور گل کے ساتھ

بمقام گل باغ سمنگلی روڈ، کوئٹہ

بروزِ بدھ 07 اگست 2024ء

انتساب

لفظ پڑھنے

لکھنے اور سمجھنے

والوں

کے نام!

فہرست

عرض

ادب اور اردو ادب سے شناسائی مجھے تب ہوئی جب میں نے بلوچستان یونیورسٹی سے ایم اے اردو ریگولر حیثیت میں کیا۔ ایم اے سال آخر میں طلبہ سے ایک ایک تحقیقی مقالہ لکھوایا جاتا ہے تاکہ تحقیق و تنقید سے آگاہی بھی ہو اور منوں مٹی تلے دبے ادیبوں کی عرق ریزی کا سراغ بھی لگایا جاسکے۔ میں نے مولانا عبدالخالق ابابکی کی شخصیت اور فن پر مقالہ لکھا۔ اس تحقیقی کام کے لیے مجھے تقریباً پانچ دفعہ مستونگ جانا پڑا۔ سو، زندگی میں پہلی بار مستونگ بھی دیکھا اور مقالہ بھی کامیابی سے مکمل ہوا۔ یہ مقالہ 2016 میں براہوی اکیڈمی کوئٹہ، (رجسٹرڈ) نے باقاعدہ کتاب کی شکل میں شائع کیا۔

اس دوران میں اپنی ہم جماعت ایک فیمیل طالبہ کے تحقیقی مقالے (کاپی پیسٹ) میں کافی مدد بھی کی، دراصل وہ آغا گل پر ریسرچ کر رہی تھی۔ میں نے تب (2010) تک آغا گل کا ایک افسانہ بھی نہیں پڑھا تھا، اور نہ ہی جون 2024 تک پڑھنے کی توفیق ہوئی۔ البتہ اتنا اتفاق ضرور ہوا تھا کہ بلوچستان میں آغا گل نام کا کوئی افسانہ نگار بھی وجود رکھتا ہے۔ اور دل چسپ بات یہ ہے کہ میں اب تک یہی سمجھا تھا کہ یہ وہی آغا گل ہے جو بریگیڈیر بھی ہے۔ حالاں کہ بریگیڈیر گل ان کا بھائی ہے۔

ہوا یوں کہ 9 جون 2024 کو کوئٹہ میں ایک مشاعرے میں اور یجنل آغا انور گل سے ملاقات ہوئی، تعارف ہوا، باتیں ہوئیں، رابطہ نمبرز کا تبادلہ ہوا اور واٹس ایپ پر پی ڈی ایف فائل میں ان کی کتابیں وصول کیں۔ میرا ارادہ تھا کہ ان کے افسانوں پر ایک مختصر مضمون لکھوں، مگر مختصر مضمون لکھنے اور ان کے افسانے تفصیل سے پڑھنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ یہ مختصر مضمون ناکافی ہے، کیوں نہ ایک مختصر کتاب ہو جائے۔ دوسری جانب اس مختصر سترہ صفحات پر مشتمل مضمون (آغا گل کا فکری اور فنی مطالعہ) کو آغا گل نے چوبیس گھنٹوں کے اندر کتابچے کی شکل میں چھاپ کر اس کی چالیس کاپیاں بنوائیں اور چند کاپیاں میرے حوالے کیں۔ اس موقع پر یہ طے پایا کہ اگر اس مضمون کو پھیلا کر ایک کتاب کی شکل دی جائے تو بہتر رہے گا۔

اس کے بعد ان کے افسانوں، ناولوں اور شاعری کا از سر نو مطالعہ کیا اور آہستہ آہستہ اپنے لیپ ٹاپ میں آغا گل پر کتاب (گل شناسی) لکھنا شروع کیا۔ یہ میری پہلی کتاب ہے، البتہ گذشتہ چار سال سے میں اردو اور انگریزی زبان میں مختلف موضوعات پر آرٹیکلز لکھتا اور شائع کر تا رہا ہوں۔ آغا گل پر اس سے پہلے کتنی کتابیں لکھی گئی ہیں اور بعد میں کتنی لکھی جائیں گی، اس کا مجھے کوئی علم نہیں۔ میری یہ کوشش کہاں تک معیاری اور قابل قبول ہو گی، یہ فیصلہ قاری پر منحصر ہے۔ میں نے اپنی اس کتاب میں اپنی رائے کو درست ثابت کرنے یا دوسروں کی رائے کو غلط قرار دینے کے لیے کہیں بھی کسی مصنف یا سکالر کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ البتہ آغا گل کے اپنے افسانوں اور ناولوں سے بڑی تعداد میں اقتباسات کو نقل کیا ہے، کہ اس کے سوا چارہ اور فائدہ نہیں تھا۔ اس کتاب میں میں نے اپنی بات کی ہے، اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور اپنے الفاظ کو بہ ذات خود حوالہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ میں نے آغا گل کو پڑھا، سمجھا اور بعد میں ان پر لکھنا شروع کیا۔ آغا گل بلوچستان کا عوامی افسانہ نگار ہے۔ میں نے آغا گل کے افسانوں، ناولوں اور شاعری کو کیسے پایا، یہ اس کتاب کی زینت ہے۔

یہ آغا گل پر لکھی گئی کتابوں میں سے ایک کتاب ہو سکتی ہے، مگر اچھی، مکمل اور تسلی بخش کتاب نہیں ہو سکتی۔ میں چوں کہ ایک پروفیشنل لکھاری، ادیب، محقق یا نقاد نہیں کہ عام پڑھنے والوں یا آغا گل پسند قارئین کی توقعات پر پورا اتر سکوں؛ بہ ہر حال، اپنی محدود علمی بساط کی حد تک یہ سعی ضرور کی ہے کہ کوئی گوشہ تشنہ نہ رہ جائے۔

اس کتاب میں آغا گل کے حالاتِ زندگی، بلوچستان ازم، ان کی افسانہ نگاری، ناول نگاری، غیر افسانوی نثر اور شاعری پر اجمال سے لکھا ہے۔ اس اجمال کو فکری اور فنی زاویوں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ آخر میں حاصل کلام کے بعد فرہنگ بھی شامل ہے۔ فرہنگ کے بعد خلاف معمول آغا گل کی چند یادگاری تصاویر بھی اس کتاب کا حصہ ہیں۔ اس مختصر کتاب میں تفصیل سے احتراز برتا گیا ہے، خواہ یہ تفصیل آغا گل کی ذاتی زندگی سے متعلق ہو یا ان کے فن سے متعلق ہو۔ یہاں تمام افسانوں یا افسانوی مجموعوں کا جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ ان معدودے چند افسانوں کا نچوڑ لکھا جائے جس سے آغا گل کی فکر و فن کے سماجی، سیاسی، مذہبی، معاشی اور جغرافیائی پہلوؤں سے واقفیت ہو سکے۔ ورنہ تمام افسانوں کے خلاصے لکھنا دراصل افسانوں کی بے وقعتی اور افسانہ نگار سے خیانت کے مترادف ہو گا۔

آغا گل کی فکر و فن کو میں نے ایک نئی اصطلاح 'بلوچستان ازم' کے ذریعے بھی سمجھانے کی کوشش کی ہے، اور میں نے ان کو افسانوی ادب میں بلوچستان ازم کا سرخیل اور نقشِ اول بھی کہا ہے۔ اس حوالے سے یہ ٹرم کہاں تک درست اور بر محل ہے، یہ فیصلہ بھی قارئین کے سپرد ہے۔

یہ ایم اے، ایم فل یا پی ایچ ڈی کا مقالہ نہیں ہے، اور نہ ہی یہ کتاب کسی تحقیق یا تنقید کے اصولوں پر پورا اترتی ہے۔ یہ آغا گل کی فکر و فن پر ایک آزادانہ اور آوارہ تحریر ہے۔ میں نے اس کتاب کا ایک ایک لفظ پوری ذمے داری کے ساتھ لکھا ہے اور اس میں کسی بھی قسم کی بیرونی ترمیم و اضافے کا روادار نہیں ہوں، مگر میرے خیالات کے ردِ عمل میں جنم لینے والی ادبی تحریروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ متوازن تحریری اختلاف رائے سے ذہانت اور بصیرت کشید کرتا ہوں۔ تاہم میرے نزدیک کسی صنف کا بہترین ناقد وہی ہو سکتا ہے جو اس کے تخلیقی مراحل سے بھی گزر چکا ہو، یعنی تخریب کے بعد تعمیری صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ یہ کتاب خرید و فروخت کی شاید قابل نہ ہو، مگر احباب میں مفت تقسیم کرنے کی قابل ضرور ہے۔

اس کتاب کی تکمیل میں بنیادی کردار ادا کرنے پر اپنے ادبی ذوق اور آغا گل کے خلوص کو داد دیتا ہوں۔ اگر یہ دونوں نہ ہوتے، تو یہ کتاب بھی نہ ہوتی۔ ہر تخلیق کا اصل منبع محبت ہے۔

آخر میں اپنی فیملی، جون اور زریون کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے میرے اس تخلیقی سفر میں رکاوٹ ڈالنے کے بجائے مجھے سپورٹ کیا۔

سید فضل الرحمان تنہا غرشین

لکچرار اردو، گورنمنٹ بوائز ڈگری کالج پشین۔

03303732667

fazal.gharshin@gmail.com

آغا گل کا بلوچستان ازم

آغا انور گل معروف ماہر تعلیم محمد اکبر خان کے ہاں 19 نومبر کو ہرنائی شہر میں پیدا ہوئے۔ کل پانچ بہن بھائی ہیں۔ سابق وائس چانسلر بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ، آغا احمد گل ان کے بڑے بھائی اور آغا آصف گل ان کے چھوٹے بھائی ہیں۔ طاہرہ گل اور ظاہرہ گل ان کی بہنیں ہیں۔ نسرین گل (نارنگ) ان کی شریکِ حیات ہے۔ ظاہرہ گل، عنبرین گل اور نیلمبر گل ان کی بیٹیاں اور آغا محمد طاہر گل ان کا اکلوتا بیٹا ہے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم برنس ہائی سکول سبی اور گورنمنٹ مڈل سکول زیارت سے حاصل کی۔ میٹرک اسلامیہ ہائی سکول کوئٹہ، انٹر میڈیٹ گورنمنٹ سائنس کالج کوئٹہ، بی اے گورنمنٹ ڈگری کالج سریاب روڈ کوئٹہ اور ایم اے اردو بلوچستان یونیورسٹی سے کیا۔ ایم اے انگلش اور ایل ایل بی بھی ڈگریاں بھی حاصل کی ہیں۔ جرمنی سے ہیومن ریسورس منیجمنٹ میں ڈپلومہ اور تھائی لینڈ سے مارکیٹنگ سٹرٹیجی میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ 1972 میں گورنمنٹ کالج مستونگ میں لکچرار اور بعد ازاں بلوچستان یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں بھی لکچرار تعینات ہوئے۔ 1979 میں سی ایس ایس کا امتحان پاس کر کے محکمہ پوسٹ پاکستان میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ 2011 کو بطور ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل پاکستان پوسٹ 21 گریڈ میں ریٹائر ہوئے۔

آغا گل نے اس وقت دو درجن کے قریب افسانوی مجموعے، چھے ناول، پانچ انگریزی کتب اور تاریخ بلوچستان پر کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان کے فن اور شخصیت پر بیس سے زیادہ ایم فل، پی ایچ ڈی اور ایم اے لیول کے مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ ان کے اعزاز میں آغا گل نمبر 2011، ماہنامہ سپوتنک لاہور، آغا گل خصوصی ایڈیشن، روشناس کراچی، آغا گل خصوصی نمبر اور دیگر ادبی رسائل و جرائد شائع ہوتے ہیں۔

آغا انور گل کا خاندان زمین دار تھا، جو 1900 میں بلوچستان آیا تھا۔ وہ جالندھر آیا جایا کرتے تھے۔ ان کا دادا، چچا اور ماموں برٹش آرمی میں گئے، جو اس وقت Prestigious Job سمجھا جاتا تھا۔ ان کے خاندان کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مگر بٹوارے کے بعد اس خاندان نے پاکستان کی محبت میں اپنا اصل تشخص کو داؤ پر لگا کر تباہ حال مہاجر کیمپوں سے ہوتا ہوا

پاکستان آیا، اور یہاں سکونت اختیار کرلی۔ وہ تقسیم کے چار برس بعد پیدا ہوئے، اور جوان ہوتے ہی ان پر یہ عقدہ کھلا کہ وہ تو نان لوکل اور پناہ گزین ہے اور نیچرل برتھ رائٹ سے محروم ہے۔ سرکاری کوائف میں پیدائش کے خانے میں Arrival لکھا جاتا تھا، جس عقوبت سے اب ان کے بچوں کو بھی گزرنا ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہی وطن میں درجہ سوم کے شہری بن گئے۔ اس دوران میں آبادکاروں پر پے درپے حملے ہوئے جس میں ان کو جائیدادوں سے بے دخل کیا گیا اور ہزاروں اساتذہ اور پولیس اہل کاروں کو Repatriate کیا گیا۔

آغا انور گل کے افسانوں اور ناولوں سے بلوچستان بے ساختہ جھلکتا ہے۔ ان کے ہاں بلوچستان کے پہاڑوں، سمندروں، وادیوں، رہن سہن، روایات، عقائد، اقدار، کھیل تماشوں، رشتوں، پوشاک ولباس، فصلوں، قبائلی جھگڑوں، جرگوں، تصفیوں، سماجی بغاوتوں، مہمان نوازیوں، تحریکوں، احتجاجوں، ہڑتالوں، مزاروں، ہوٹلوں اور دیگر تہذیبی وثقافتی نقوش بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے بلوچستانی معاشرے کی امنگوں، خواہشوں، امیدوں، آنسوؤں اور مسکراہٹوں کی بے لاگ ترجمانی کی ہے۔ انھوں نے رجعت پسندی کے خلاف جنگ کرکے نئے باشعور بلوچستانی معاشرے کی تشکیل کی ہے۔ وہ بلوچستانی ادب میں بلوچستان ازم کے اولین نقش اور سرخیل ہیں۔ روئے زمین پر بلوچستان کا وجود، اس کے اصل باسی، ان کو درپیش چیلنجز، حالات کا مردانہ وار مقابلہ، قید وبند کی صعوبتیں، مزاحمت اور انقلاب، اور اس دھرتی ماتا کی حفاظت—ان تمام موضوعات سے مجموعی طور پر جو تاثر ابھرتا ہے، میں اس کو بلوچستان ازم کہتا ہوں، جو آغا گل کی اصل پہچان اور ترکہ بھی ہے۔

وہ طبعاً نفیس اور خوش لباس انسان ہیں۔ براہوی اور بلوچی تہذیب سے بھی قلبی محبت رکھتے ہیں۔ جمہوریت پسند ہیں اور امریت سے نفرت کرتے ہیں۔ کیپیٹلزم کے مخالف ہیں اور سیکولرزم کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ اسلامی مطالعے کے ساتھ ساتھ بھگوت گیتا، انجیل، زبور اور تورات کا بھی وسیع مطالعہ رکھتے ہیں۔ بلوچستان میں رواں جبری گمشدگیوں اور ماورائے عدالت قتال پر دل برداشتہ ہیں۔

"اسٹریلیا میں بلاوجہ سانپ مارنے کی سزا دس ہزار ڈالر یا دس برس قید ہے۔ ہم مسخ شدہ انسانی لاشوں پر احتجاج کرتے ہیں تو سرکار بغاوت / کار سرکار میں مداخلت کے جرم میں گرفتار کر لیتی ہے۔"

وہ 'دو قومی نظریہ' کے سخت مخالف ہیں۔ ان کے نزدیک 1857 کی جنگ آزادی کے بعد یہ نظریہ اور کانگریس بدنام زمانہ ہیوم اور انگریزوں کی سازش تھی، اور اس کے مقابل میں مسلم لیگ بنا کر انگریز کے خطاب یافتہ نواب آپ ڈھاکہ سلیم اللہ کو اس کا صدر بنایا۔ ان کے نزدیک ہندو مسلم فسادات کی ابتدا بھی انگریزوں کی سازش تھی۔ امریکا دراصل وار انڈسٹری پر چل رہا ہے، تو 1930 میں اسلحہ کے کاروبار سست پار کنے کی وجہ سے امریکا گریٹ ڈپریشن کا شکار ہو گیا تھا۔ اس بحران سے نکلنے کے لیے امریکا نے اس جغرافیے کو مختلف بنیادوں پر مختلف حصوں میں اس طرز سے تقسیم کیا کہ اب ان کے درمیان گولی کے بجائے زبان اور تعقل کے چلنے کے تمام راستے مسدود ہو گئے۔ حقیقت یہ تھی کہ روس، امریکا، چین اور دیگر عالمی طاقتوں کو 'سپر پاور انڈوپاک' کسی قیمت پر قابلِ قبول نہ تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ جنگ کے دوران میں دو قومی نظریہ خراٹے لے رہا ہے، اور یہ دعوے کیے جاتے ہیں کہ ہندو، مسلم اور سکھ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں اور سب نے مل کر ملک کا دفاع کرنا ہے۔

ان کے نزدیک دو قومی نظریے نے مسلمانوں کو تین غیر دوستانہ اور معاندانہ ممالک (انڈیا، پاکستان اور بنگلا دیش) میں تقسیم کر دیا۔ جس کی وجہ سے ان تینوں اقوام کا سرمایہ، مال و دولت، وسائل، معدنیات اور پوری توجہ عوام کی فلاح و بہبود، تعلیم، صحت، روزگار، امن اور انفراسٹرکچر کی بہتری کے بجائے اسلحہ خریدنے، ایٹمی بم بنانے، عسکری تنصیبات تعمیر کرنے اور دفاع پر صرف ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تینوں ممالک میں اب تک بڑے پیمانے پر بدعنوانی، جرائم، بھوک، خودکشیاں، عورتوں کا استحصال، اقلیتوں سے ناجائز سلوک اور ملٹری کنٹرولڈ موروثی سیاسی نظام پایا جاتا ہے۔

وہ ایک محب وطن پاکستانی ہیں اور جناح بابا کی 11 ستمبر 1947 کی غیر سنسرڈ شدہ تقریر کو اپنا رہنما اور مشعل قرار دیتے ہیں۔ وہ ہجرتِ مدینہ اور مواخات پر یقینِ کامل رکھتے ہیں اور سوال اٹھاتے ہیں کہ نام نہاد مذہبی رہنما اور اسلام الاپنے والے عناصر مواخات سے کیوں نظریں چرا رہے ہیں؟ وہ ہمسایہ ممالک سے خوش گوار تعلقات کے بھی خواہاں ہیں۔ افغان مہاجرین کے

دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔ جہاد، شہادت اور حب الوطنی کے نام پر انسانی زندگیوں سے کھلواڑ پر افسردہ ہیں۔ اقوام متحدہ کو بدمعاشوں کی پناگاہ، سعودی عرب کو امریکا کا بغل بچہ اور پاکستان کو فوجی ریاست قرار دیتے ہیں۔ سیاست زدہ مذہب سے بے زار ہیں، مگر اہل بیت سے گہری عقیدت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالمالک بلوچ کی نیشنل پارٹی کے ساتھ سیاسی انسلاک رکھتے ہیں اور نواب محمد اکبر خان بگٹی کے لیے بھی بڑی عقیدت رکھتے ہیں۔

"نواب اکبر خان بگٹی دلوں میں زندہ، ایک درخشندہ استعارہ، غلامی کے خلاف تحریک کا روشن باب ہیں۔ ان کی شہادت دراصل وفاق کی قبر کا کتبہ اور بلوچ تحریک کا نیا سنگِ میل ہے۔"

پنڈت، مولوی اور غزل کو برصغیر کی تباہی کا سبب ٹھہراتے ہیں۔ افسانوی ادب سے کافی لگاؤ ہے۔ بلوچستانی شعرا، افسانہ نویسوں اور نقادوں سے غیر مطمئن ہیں۔ وہ قانون سازیوں، سزاؤں اور قتل وغارت کے بجائے افسانہ نگاری کے ذریعے امن لانے کے متمنی ہیں۔ وہ لاشیں اٹھانے کے درمیانی وقفے کو امن کہتے ہیں، اور بلوچستانی نوجوانوں میں کبڑاپن کی وجہ ان کی جوانی ہی میں لاشیں اٹھانا اور جنازوں کو کندھا دینا ٹھہراتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پاکستان واحد ملک ہے جہاں غریب امیر کو پال رہاہے۔ گیس، بجلی، پانی اور دیگر ضروریات زندگی سے محروم ہونے کی وجہ سے بلوچستان کو ازراہ تفنن مچھ جیل کہہ کر پکارتے ہیں۔

"ایک سی گیس بجلی سہولت، ایک ساپانی، ایک سارہنابسنا، ایک ساکھاناپینا اور ایک سالباس-وسیع ترمفادعامہ میں ملک کو مچھ جیل بنادیاجائے۔"

بلوچستان کے تعلیمی اداروں میں اردو کے نصاب، کتب اور پڑھانے کے طریقہ کار کو قتل اردو اور عقل دشمنی کہتے ہیں۔ جامعہ بلوچستان اور دیگر بلوچستانی جامعات اور کالجوں میں اردو تحقیقی مقالوں کے معیار کو پست، تقلیدی، ادبی سرقہ زنی اور تخلیق دشمن سمجھتے ہیں۔ بلوچستان میں اردوادب سے متعلقہ مراکز، مجالس، اخباری ادبی صفحات، رسالوں اور پبلشنگ اداروں کو اسٹیٹ کنٹرولڈ اور بیڈلی سنسرڈ کا نام دیتے ہیں۔ اور اسی طرح بلوچستان کے ادیبوں میں فکری پرواز کی کوتاہی کے ساتھ ساتھ

ان میں بے اتفاقی سے بھی نالاں نظر آتے ہیں۔ان کی خواہش ہے کہ سیاسی لحاظ سے بلوچستان میں بلوچستان لیڈ اینڈ بلوچستان اونڈ حکومت ہو اور ادبی لحاظ سے بلوچستان کی اپنی خاص پہچان ہو۔وہ بلوچستان کو اب تک کالونیل نظام کے ماتحت قرار دیتے ہیں۔

"منڈیوں پر عسکری طاقت سے قبضہ بیسویں صدی کے نصف میں اس قدر مہنگا ہو گیا کہ اسی ملک کے موقع پرستوں کے ذریعے منڈیوں پر سیاسی قبضہ ہونے لگا۔کل کا کالو نیسٹ اب انوسٹر کا بھیس بدل کر آنے لگا۔بلوچستان کے تناظر میں صورتحال بدستور 19ویں صدی کی Gunship Diplomacy والی ہے۔"

"قومی عسکری معاہدے خفیہ ہوا کرتے ہیں،جب کہ تجارتی معاہدے قوم کو اعتماد میں لے کر بنائے جاتے ہیں۔بلوچستان کے تمام تجارتی معاہدے Classified خفیہ اور پراسرار ہیں۔جن کے باعث نوجوان Suspicious اور Confused ہیں۔سارے معاہدے Declassified کرتے ہوئے قوم کو بتایا جائے کہ کیا کیا فوائد حاصل ہوں گے۔ان میں بلوچستان کا کیا حصہ ہو گا؟"

آغا گل کسی ادبی رجحان یا تحریک سے متاثر یا اس کے مخالف نظر نہیں آتے،بل کہ وہ خود کم سے کم ایک رجحان اور زیادہ سے زیادہ ایک تحریک بننے کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں۔آغا گل نے شروع ہی میں افسانوی ادب میں ریجنل ازم کی جو مستحکم بنیاد رکھ لی تھی،اب اسی بنیاد پر بلوچستان ازم کے فلک بوس محل کی تعمیر آخری مراحل میں ہے۔اس محل کی تعمیر میں انھوں نے صرف ایک Medium یا Catalyst کا کردار ادا نہیں کیا،بل کہ خود اسی میں پوری آب و تاب سے تحلیل ہو گئے ہیں۔

آغا گل نے بلوچستان پر اتنی شد و مد سے لکھا ہے کہ اب ان کی تحریروں سے مجموعی طور پر بلوچستان کی جو تصویر بنتی ہے اس کو بلوچستان ازم کا نام دیا جا سکتا ہے۔تاہم اس سے اختلاف ممکن ہے۔ادب میں پاکستانیت کی تلاش اور نمو ایک بہت بڑا موضوع ہے،مگر کیا ادب میں بلوچستانیت کی تلاش اور نمو باقاعدہ ایک موضوع نہیں بن سکتا؟ تاہم پاکستانی ادب کے فروغ

کے لیے ادیب کا سچا پاکستانی ہونا اور دو قومی نظریہ پر غیر متزلزل اعتقاد رکھنا از حد لازمی ہے۔ اسی طرح بلوچستانی ادب کے فروغ کے لیے بھی سچا بلوچستانی ہونا ضروری ہے، مگر دو قومی نظریے کا لسانی اقرار اور قلبی تصدیق ضروری نہیں۔ بلوچستان ازم کے فروغ کے لیے وفاق کے ساتھ الحاق کے بعد 46 فی صد جغرافیے اور 6 فی صد آبادی کا درد دل میں رکھنا لازمی ہے۔

آغا گل کے اسلوب نے بلوچستان ازم کو متعارف کرایا ہے جو ایک خاص سوچ، ڈاکٹرائن اور نظریہ حیات کا ترجمان بن کر سامنے آیا ہے۔ اسلوب ایک جانا پہچانا موضوع ہے اور ان کے اسلوب پر علاحدہ مضمون لکھنا نشرِ مکرر کے مترادف ہو گا۔ تاہم، ان کے اسلوب میں ان کا عہد، تعلیم، ذاتی زندگی، ملازمت، پسند ناپسند اور جغرافیائی حقائق براہ راست کارفرما ہیں۔ وہ مابعد الطبیعات پر اعتقاد نہیں رکھتے، مگر ناسٹلجیا کی مسلسل گرفت میں رہتے ہیں۔ ان کو مسلم لیگ، دو قومی نظریہ اور دیگر سرکاری نظریات سے الگ تھلگ فکر رکھنے کے باعث ان کو شعوری طور پر ذرائع ابلاغ پر آنے سے روک دیا ہے۔ ایڈورڈ گبن اور آرنلڈ جی ٹائن ان کے پسندیدہ مورّخ ہیں۔ جسٹس ایم آر کیانی کی طرح ان کو بھی وارننگ دی گئی کہ اچھی تقریریں کرنے کے بجائے اچھے افسانے لکھ لیا کریں۔ بسا اوقات ان کو اسٹیج پر مدعو کرنے سے میزبان کی دال روٹی خطرے میں پڑ جاتی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ سرکاری تمغے حاصل نہ کرنے ہی میں عافیت اور عزت ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ جن لوگوں نے خان بہادر، سر، رائے بہادر، شمس العلما اور خطابات وصول کیے، ان کو آج کل انگریزوں کا آلہ کار سمجھا جاتا ہے۔

ان کے ابتدائی افسانے قیام پاکستان سے پیدا ہونے والے معاشی اور معاشرتی مسائل سے متعلق تھے۔ وہ شروع ہی سے سیکیولر رہے ہیں۔ 1990 تک ان پر بچپن کی فیڈ بیک اور رومانیت نمایاں رہی، لیکن رفتہ رفتہ وہ بیل گاڑی، ٹانگہ، ٹیکسی اور یکہ کی محبت سے نکل کر بغاوت کی طرف بڑھتے ہوئے سخت ریڈیکل ہوتا چلا گیا۔ اب وہ دیہاتی زندگی، مٹکا، لالٹین اور چابی والے گراموفون سے شہری زندگی اور الیکٹرونک عہد میں آئے تھے۔ وہی نظریات جنھیں بیس برس سنبھالے رکھا تھا، Paganism کا حصہ سمجھ کر اپنے سارے نظریات کو توڑ کر کچل ڈالا۔ ان پر یہ انگریزی محاورہ صادق آتا ہے:

Like a bull in a China shop

اس متلون مزاجی کے باعث ان کے سرکاری احباب نے ان سے دوری اختیار کرلی۔ وہ اگرچہ خود بھی اعلیٰ سرکاری آفیسر رہے، مگر وہ سرکاری دربار کے رنگ میں رنگنے سے محفوظ رہے۔

ان کی یہ کوشش برسوں قدیم تجربوں اور عہدِ حاضر کی دانش کی میلاپ ہے۔ اس میں Individualism کے ساتھ Collectivism، Impressionism کے ساتھ Expressionism ، Absurdism کے ساتھ Dadaism اور Marxism کے ساتھ Modernism دوش بہ دوش چلتے نظر آتے ہیں۔ مذہبی اور سماجی عقائد کے انجماد کے برعکس انسان کا ادبی شعور مسلسل حرکت میں ہے اور ترقّی کرتا رہا ہے۔ پرانے ادبی موضوعات داستان کی ہیئت میں بیان کیے جاتے تھے، جن کا راوی، مخاطب اور کردار تینوں مچھیرے، کسان، لکڑہارے، چوپان، چرواہے اور فارغ البال لوگ ہوا کرتے تھے، جب کہ اکیسویں صدی کا انسان اپنے وجود اور اپنی بقا کے لیے ماحول اور دنیا سے نبرد آزما ہے۔

آغا گل نے فرضی کہانیوں اور خیالی کرداروں کے بجائے بلوچستان کی سماجی تہذیب، معاشی تمدّن، سیاسی کلچر اور ثقافتی رسومات کو اپنا موضوع بنایا۔ انھوں نے بلوچستان کے متعلق برطانوی حکمرانوں اور ان کے منشیوں کی لکھی ہوئی تاریخ کو یک سر مسترد کیا ہے۔ اسی طرح وہ سلاطینِ دہلی اور مغلیہ دور کے واقعہ نگاروں کو بھی نہیں مانتے، کیوں کہ ان کے نزدیک ان مورخوں کا بلوچستان کے ساتھ دور کا بھی تعلق نہیں۔ برطانوی حکمران ہوں یا مغل حکمران، ان کی اوّلین ترجیح یہ تھی کہ ایران اور افغانستان کے تجارتی راستے محفوظ ہوں اور بلوچستان کے حکمران حسبِ روایت تجارتی قافلوں کو سیکیوریٹی فراہمی کے نام پر ٹیکس وصولی کیا کریں اور مذید خاموش رہیں۔

آغا گل کے بلوچستان ازم کے دفاع میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیائے ادب میں نہ یہ وصف نیا ہے اور نہ ہی یہ اصطلاح اجنبی ہے۔ بہزاد لکھنوی نے لکھنو کی فضا میں "حکیم بڈھن" سے منسوب افسانے لکھے۔ اسی لکھنو کی فضا میں مرزا ہادی رسوا نے "امراؤ جان ادا" اور پنڈت رتن ناتھ سرشار نے "فسانہ آزاد" لکھا ہے۔ اسی طرح بلوچستان کی فضا میں آغا گل نے آبِ حیات، گوانگو، بوانٹو، سرکک، پہاڑ اور محبت، چار گل جیسی کہانیوں کو سپردِ قلم کرکے قاری کو اس جغرافیے کے ایک صدی

پہلے کے خالص دیہاتی یا نیم شہری ماحول سے متعارف کرایا۔ انھوں نے سمندروں پر ہیمنگوے اور Herman Melville کی طرح بلوچ ساحل پر "گردول" کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ جس میں انھوں نے سمندری لوٹ مار، بحری قزاقی اور سرکاری چھتری تلے لوٹ مار کی تاریخ رقم کی ہے۔ یہ کتاب بلوچستان ازم کے باب میں ایک اہم اضافہ ہے۔ نوجوان لکھاریوں نے جیسے شیر دل غیب، فارس مغل، وسیم شاہد اور شیخ فرید نے ان کا اتباع کیا ہے۔ ڈاکٹر اعظم بنگلزئی صاحب، رشید حسرت اور شفقت عاصمی صاحب نے بھی آغا گل کے ریجنل ازم سے کافی حد تک استفادہ کیا ہے۔ ان کا ناول 'بابو' تو اب بلوچستانی افسانوی ادب کی دنیا میں ایک Trend Setter بن گیا ہے۔ وہ اسی ناول میں برملا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ کوئٹہ کے ٹھڑوں کی زبان (Colloquial language) لکھتا ہے۔ وہ ایک اعلی تعلیم یافتہ شخصیت تھے، لکچرار رہے، یونیورسٹی میں پروفیسر رہے، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز بلوچستان کیمپس میں کا سربراہ رہے اور پھر ریٹائرمنٹ تک اعلی انتظامی عہدوں پر رہے۔ اسی وجہ سے ان کو مقامی زبانوں، ادبی تقاضوں اور جغرافیائی حقائق کا مکمل علم تھا۔

عطاشاد کی شاعری بھی بلوچستان ازم کی عظیم نشانی ہے۔ آغا گل کے ناول "بابو" میں Jargon اور Colloquial کا استعمال کیا گیا ہے۔ سنا ہے کہ اس ناول پر اب ایک فلم بھی بن رہی ہے۔ اس ناول کو پڑھتے ہوئے مجھے لگتا ہے گویا میں اپنے دوستوں کے ساتھ کوئٹہ میں گھوم رہا ہوں۔ ڈاکٹر پروفیسر رشید امجد کہتے ہیں کہ آنے والی نسلیں پاکستان کی عمومی اور بلوچستان کی خصوصی تاریخ کو آغا گل کے فکشن میں تلاش کریں گے۔ آغا گل کا بلوچستان ازم آج ایک نیا رویہ معلوم ہوتا ہے، مگر امید ہے مستقبل میں بلوچستان کے ادیبوں کے لیے یہی نیا رویہ ایک پسندیدہ اور مستند اسلوب مانا جائے گا۔

آغا گل اور خیر جان بلوچ فرسٹ ائیر سے ہم جماعت تھے۔ جب بلوچستان میں پہلی بلوچ حکومت گرائی گئی اور بندوق کا قانون نافذ کیا گیا تو ان کے متعدد کلاس فیلوز پہاڑوں پر چلے گئے۔ ناول "دشتِ وفا" دراصل اسی دور کی غیر تحریری تاریخ ہے، جس کے بارے میں ڈائریکٹر پریس انفارمیشن (عطاشاد) کو اس ناول کے نہ چھپنے اور اس پر پابندی لگنے کا خدشہ تھا، مگر ٹل گیا۔

ان کی نظر میں خالص اپنے نظریات کی پیش کش پر پچنگ ہے، خالص اپنے دور کے واقعات کی پیش کش جرنلزم ہے اور خالص تاریخ لکھنا ہسٹری ہے، جب کہ افسانہ لکھنا ان سب سے ماورا اور تلوار کی دھار پر چلنا ہے۔ ان کی نظر میں ہمارا سب کچھ غیر ملکی اترن ہے۔

"ہمارے سارے ادبی، سیاسی، سماجی، معاشی نظریات بھی غیر ملکی اترن ہیں۔ ہمارے نظریات یہودی لابی کنٹرول کرتی ہے۔ فرائیڈ، کارل مارکس، روسو اور میکیاولی کے نظریاتی چیتھڑے ہماری انٹلکچول کلاس کا لباس ہیں۔ ہمارے نقاد غیر ملکی حوالے کی بیساکھیوں کے بغیر چل نہیں سکتے۔ یہ ناول، یہ ڈرامہ یہ سب بھی تو غیر ملکی ادب سے ہم نے لیا ہے۔۔۔ ہمارا سب کچھ کباڑی بازار ہے۔ ہمارے ذہن بھی فرسودہ نظریات کے کباڑی بازار ہیں۔"

بہ حیثیتِ عام شہری ہو، بیورو کریٹ ہو یا ادیب، آغا گل کو ان کا صحیح مقام نہیں دیا گیا۔ انھوں نے 1988 میں سی ایس گروپ گریڈ اٹھارہ کی حیثیت سے ڈائریکٹر ایڈمن سیندھک پروجیکٹ کے لیے درخواست دی، تو چیئرمین بزنجو نے آغا گل کے بجائے آغا گل ہی کا 7 گریڈ کلرک عبد اللہ بلوچ کو اس پوسٹ پر تعینات کیا۔ ان کے تجربے کے مطابق فوج میں بھی یہی حالت ہے، لوکل کیپٹن سول میں بھیجے جاتے ہیں اور نان لوکل کبھی زیرِ غور نہیں آتے۔ انھوں نے ہمیشہ کے لیے نان لوکل اور پناہ گزین کے طعنے (تاریخ کا جبر) شرابوں کی طرح پی پی کر برداشت کیے۔

افسانوی ادب میں آغا انور گل بلوچستان کی خاص پہچان ہیں۔ بد قسمتی سے بظاہر یوں لگتا ہے کہ ان کے فن کی صبح ان کی طبعی زندگی کی شام سے شروع ہونے والی ہے۔ ویسے بھی آغا گل آج کے لیے نہیں لکھتے!

"اس نظام کو سنگسار کرنے کے لیے میری جھولی میں پتھر نہیں الفاظ ہیں۔ نصف صدی کا لفظی پتھراؤ کچھ نہ بگاڑ سکا۔ ایسی موت سے زندگی بہتر ہے، سوچتا ہوں افسانہ لکھنا چھوڑ دوں۔"

آغا گل کی تخلیقات

آغاانور گل کے افسانوی مجموعے

- گور ریچ
- آکاش ساگر
- ڈاک پہ ڈاکہ
- تارمہ
- گوانگو
- پیاز
- پرتھوی، غوری
- مہرگڑھ
- انتخاب گل
- پرندہ
- مشین گردی
- سونے پہ اگی بھوک

- آب حیات
- بولان کے آنسو
- حقل دما
- راسکو
- پاسینگان کا مطلب کیا

آغا گل کے ناول

- بیلہ
- بابو
- دشت وفا
- فسانہ جنات
- کافرِ عشقم
- غازی نورا مینگل

آغا گل کی دیگر علمی و تحقیقی تخلیقات

- پارس لفظین حضرت علی ابی طالب کی پیشین گوئیاں
- شدرو مرجان
- بلوچی بائبل کی تاریخ
- بلوچستان میں اردو فکشن

بلوچستان میں اردو فکشن: آغا گل کی نظر میں

بلوچستان میں اردو افسانے کی روایت کے سلسلے میں آغا گل نے "بلوچستان میں اردو فکشن کا تاریخی تناظر" کے نام ایک سو بیس صفحات پر مشتمل ایک تحقیقی اور تنقیدی کتاب لکھی ہے، جس کی پہلی فصل میں اردو اور اردو ادب کی تاریخ، اردو کی ترقی میں فورٹ ولیم کالج کا حصہ اور غیر ملکی خدمات، اردو سے غیر مسلم کی محبت، اردو ادب کالونیل دور میں، اردو زبان اور قومی ترانہ اور فکشن کی ابتدا کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ جب کہ دوسری فصل میں بلوچستان میں اردو، فکشن کا لسانی نقشہ، قدیم بلوچی اور براہوی ادب، اخلاقی کہانیوں کا دور، برصغیر کی تقسیم، بلوچستان کا المیہ، بلوچستان کے ادیبوں کا معاشی اور معاشرتی نظام، بلوچستان میں افسانہ نگاری، ادبی تحریکیں، انگریزی سے عدم واقفیت، حکومتی رویے، اکیسویں صدی اور شعوری بیداری کا آغاز، فکشن کا عنوان اور فکشن کی فضا سے بحث کی گئی ہے۔

کہانی سننا اور سنانا انسانی جبلت کا حصہ ہے۔ ابتدائی انسان ایک دوسرے کے ساتھ رابطے کے لیے اشاروں سے، پھر اشکال سے، آوازوں سے اور آخر میں تحریر سے کام لینے کے قابل ہوگئے۔ دنیا کی پہلی تحریری کہانی "غرقاب سفینہ "2200ق م میں تخلیق ہوئی ہے۔ قدیم مصری کہانیاں 1900 برس قدیم ہے۔ مغربی دنیا کی اولین رومانی کہانی زینوفون (EXENOPHON) نے چوتھی صدی ق.م میں تحریر کی۔ ہندستان کی شکنتلا، براہمنا، رامائن، مہابھارت، دیو جانی، نل ودمینتی اور بدھ مت کی جاتکائیں اس سرزمین پر پہلے تحریری نمونے ہیں۔

اردو زبان کو وقتاً فوقتاً مختلف اسماء یعنی اردوئے معلیٰ، ہندی، گجری، ہندستانی، ریختہ، دکنی، دہلوی اور اردو کے نام سے بھی پکارا گیاہے۔ اردو کے آغاز کے متعلق محمد حسین آزاد، رام بابو سکسینہ، ڈاکٹر مسعود حسین خان، ڈاکٹر شوکت سبزواری، سرسید احمد خان، نصیر الدین ہاشمی، پروفیسر محمود شیرانی، ڈاکٹر محی الدین زور اور دیگر محققین نے بھی اپنے اپنے نظریات پیش کیے ہیں، جو آغا گل کی اس کتاب میں تفصیل بیان کیے گئے ہیں۔ تاہم اس حوالے سے آغا گل بھی اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"اردو زبان عام بول چال کی زبان تھی، جب کہ ریختہ شاعری یا منظوم اظہار کی زبان تھی۔ اردو زبان پہ ابتدائی دور میں ہندی اور برج بھاشا اور پوربی زبانوں کے اثرات تھے، جس کے باعث تلفظ اہلِ ہند کے لیے مانوس و خوش گوار تھا۔ جوں جوں یہ ایک ادبی زبان میں منقلب ہوئی، اس میں فارسی، عربی اور ترکی الفاظ شامل ہوتے چلے گئے۔ فارسی رسم الخط میں کچھ ترمیم کے ساتھ اردو کی صورت بنتی چلی گئی۔ فارسی بحریں استعمال ہونے لگیں، اور فارسی تراکیب کی بھرمار ہو گئی۔"

بلوچستان میں اردو زبان کی ابتدا کو انگریزوں کی آمد کے ساتھ جوڑتے ہیں:

"اور جیسا کہ اکیسویں صدی میں بلوچستان کو سرکاری طور پر پس ماندہ قرار دیا جاتا ہے۔ یوں پس ماندہ پہ ترقی یافتہ کو حکومت کرنے کا حق تفویض کیا جاتا ہے۔ ان کی اس سائیکی کے باعث ان کا جسم اور دھڑ تو ہندی تھا مگر ذہن ان کا حملہ آوروں کا رہا"

"اردو کی ترقی میں انگریزوں کا کردار بھی اہم ہے۔ احمد شاہ درانی کو حملہ کرنا ہی تھا تو مرہٹوں کی طاقت کچل کر ہندوستان میں ہی بیٹھ رہتا مگر وہ محمود غزنوی کی مانند مال و اسباب، لونڈیاں، غلام سمیٹ کر واپس چلا گیا۔ جس کے باعث انگریز اور فرانسیسی VACUUM اور CHAOS کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوستان چڑھ دوڑیا اور ہندوستان پہ قابض ہو گئے۔ بلکہ افغانستان پہ بھی چڑھ دوڑے۔ احمد شاہ انگریزی قبضے کا ذمہ ارہے۔ دو سو برس غلامی اسی نے دلوائی۔"

"اردو کے اثرات بلوچستان میں انیسویں صدی سے ملتے ہیں۔ بلوچستان ایک کثیر القومی اور کثیر الثقافتی صوبہ ہے۔ مختلف قومیتیں یہاں مختلف زبانیں بولتی ہیں۔ جیسے پشتو، براہوی، بلوچی، دہواری، سندھی، فارسی، ہزارگی، سرائیکی اور آبادکاروں کی زبان پنجابی۔ قومی زبان کی شناخت بہت دیر سے ہوئی۔"

آغا گل لکھتے ہیں کہ بلوچستان اپنی سیاسی اور ادبی مستند تاریخ سے محروم ہے اور بلوچستانی ادیب خدا کی عبادت یوں کرتے ہیں کہ شیطان بھی ناراض نہ ہو اور خدا بھی خوش رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سرزمین پر اب تک بڑا اور مستند ادب تخلیق نہ ہو سکا۔

"ہمیں سرکاری طور پر نسل در نسل گڑبڑ تاریخ (Distorted History) پڑھائی جاتی ہے۔ تاریخ بجائے خود ایک فکشن بن گئی ہے۔ جس کے دیومالائی کردار وکٹورین ناولز کے ہیرو کی مانند شجاع، بہادر، باکردار، ولی اللہ، حق پرست اور رول ماڈلز ہیں۔ کیا مجال کہ ہمارے سیاسی لیڈروں کے اندر کوئی انسانی کمزوری آنے پائے۔"

وہ اردو زبان اور شعر و ادب کو کالونیل دور کی پیداوار سمجھتے ہیں اور ان کو برصغیر کی جینز میں بھوک اور بھکاری پن کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ان کے نزدیک بلوچستان 13 نومبر 1839 سے ایک کالونی ہے اور انگریز آقاؤں نے اسے ایجنٹوں کے ذریعے چلایا ہے۔ یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔ بلوچستان اس خطہ ارض کے لیے نسبتاً نیا نام ہے اور اس کے بہت سے نام تاریخ میں ملتے ہیں۔ کالونیل نظام نے نہ صرف بلوچستان کو معاشی لوٹ کھسوٹ سے متعارف کرایا، بل کہ اس کے رسم و رواج، تہذیب و تمدن اور تعلیم و ادب کو بھی کھوکھلا کر کے رکھ دیا۔

"برطانیہ کی عمل داری ہوئی تو برصغیر ان کی کالونی قرار پایا، لہٰذا اردو زبان کا تمام ادبی و شعری سرمایہ جس کی عمر سوا دو سو برس ہے، دراصل کالونیل ادیبوں، شاعروں کی کاوش ہے نہ کہ آزاد، باحمیت لوگوں کی۔ اس میں غلامانہ خوبو ہے۔ غلام کو محض کھانے پینے، عشق و محبت کی اجازت ہوتی ہے۔"

1912 میں سنڈیمن پالیسی کے تحت ہر قبیلے کو اس کے انگریز نواز سردار کے حوالے کر دیا، اور یوں بلوچستان میں وفاداریاں تبدیل ہونے کا رواج پنپنے لگا۔ ادب میں مذہبیت کا دخول ہوا۔ فکشن بھی مذہبیت اور عورت کی استحصالی صورت سے بدبودار ہونے لگا۔ بلوچستانی فکشنز میں تقلید، اندھی عقیدت، مابعد الطبیعات اور ضعیف الاعتقادی کے ساتھ ساتھ عورت کو پابند صوم و صلوات، چار دیواری تک محدود، شوہر کی وفادار اور شرمیلی صورت میں دکھایا گیا۔ حالاں کہ بلوچستانی عورتیں کسی مرد سے کم تر نہیں۔ وہ بہادر، جنگجو، مزاحمت کرنے والی اور ڈائنامک ہیں۔

ڈاکٹر مبشر حسن کے نزدیک برطانیہ نے دو عظیم جنگیں ہندستان کی فوج اور اناج کے بل بوتے پہ جیتیں۔ ان جنگوں میں اردو زبان کو بطور ہتھیار استعمال کیا گیا۔ آغا گل کہتے ہیں کہ اردو زبان عصائے موسیٰ کی مانند قدیم قومی زبانوں پشتو، براھوی، بلوچی، سندھی، پنجابی وغیرہ کو نگل گئی۔ پانچ ہزار برس پرانی پشتو زبان کو مقامی زبان قرار دے دیا گیا۔

"انگریزوں نے اردو زبان کو مقدس ٹھہراتے ہوئے عربی کی مانند اردو کو مسلمانوں کی پہچان اور قومی زبان قرار دے دیا۔ ۔۔ اردو اپناؤ، مسلم ہے تو اردو بول، اردو بولو، اردو لکھو، اردو پڑھو، اردو کھاؤ اور اردو بچھاؤ، اردو چباؤ۔ یہ نعرہ بازی خون گرمانے والی جذباتی مگر غیر عقلی تھی۔"

اردو زبان نے برصغیر میں رابطے بڑھائے، مگر قوم پرست اس زبان سے بد ظن ہو گئے۔ کیوں کہ پاکستان میں کسی خطے یا صوبے کی مادری زبان اردو نہیں تھی۔ حکومتی زبانی جمع خرچ کے باوجود اردو غریب ورکنگ کلاس جب کہ انگریزی حکمران خاندانوں کی زبان رہی۔ جسے اردو زبان کی کمرشل ویلیو ختم ہو گئی۔ اردو آج کل ایک عالمی اور سائنسی زبان کے بجائے صرف ایک عالمی بولی کے طور پر جانی جاتی ہے۔ ہر ملک کی اپنی زبان کے ساتھ ساتھ اپنا قومی ترانہ بھی ہوتا ہے۔ پاکستان کے قومی ترانے کے بارے میں آغا گل کا کہنا ہے:

"روس کا قومی ترانہ روسی میں ہے۔ انگلینڈ کا انگریزی میں، بنگلہ دیش کا بنگالی میں، مگر وطنِ عزیز کا قومی ترانہ قومی زبان اردو میں نہیں ہے۔ قومی ترانہ حفیظ جالندھری نے تحریر کیا، جو کبھی پاکستانی نہ بن سکا۔"

تاریخ میں بلوچستان کا نام دو سو برس سے زیادہ قدیم نہیں اور یہ نام انگریزوں کا دیا ہوا ہے۔ برطانوی پارلیامنٹ نے روس کو روکنے اور شمالی دروں کو Contain کرنے کے لیے 1893 میں افغانستان کے علاقوں کا بلوچستان سے الحاق کر لیا۔ پاکستان کے قیام کے بعد پختونخوا کو بلوچستان میں ضم کرتے ہوئے ون یونٹ میں اسے کوئٹہ ڈویژن کا نام دیا گیا۔ ون یونٹ کے توڑنے کے بعد اس صوبے کا نام بلوچستان پڑ گیا۔ بلوچستان ایک کثیر القومی اور کثیر الثقافتی صوبہ ہے۔ اردو بلوچستان میں صرف

رابطے کی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ بلوچستان میں ریاستی جبر کے باعث اعلیٰ ادب کتابوں کے بجائے انسانی سینوں میں دفن ہو گیا ہے۔ بلوچستانی کہانیوں پہ مشرق وسطی اور ایرانی ادب کی گہری چھاپ رہی ہے۔

بلوچستان میں اردو دراصل انگریز حکومت کے ملازمین اور عساکر لے کر آئے۔ مچ میں کانکنی، سندھ پشین ریلوے اور بولان ریلوے لائن بچھانے کے عمل کے دوران میں اردو یہاں مقبول ہوئی۔ دادا بھائی نوروجی کہا کرتے تھے کہ ریل نے ہندستان کی ثقافت کو نقصان پہنچایا۔ آغا گل کہتے ہیں کہ ریل نے بلوچستان کی ثقافت کو بھی نقصان پہنچایا۔ سرکاری ملازمین کے بچوں کے لیے یہاں اردو سکول کھولے گئے۔ پڑھے لکھے افراد برٹش بلوچستان میں رہتے تھے، اور یوں آہستہ آہستہ کوئٹہ اردو کا مرکز بن گیا۔ اردو فکشن کی ابتدا بھی یہاں سے ہوئی۔ تقسیم سے پہلے ابتدا میں سماج میں سکون کی وجہ سے ادیب ایمان داری، دیانت داری، اعلیٰ کردار اور دوستی جیسے موضوعات پر اخلاقی کہانیاں لکھتے تھے۔ بلوچستان میں 1918 میں البرٹ پریس کے نام سے پہلا سرکاری پریس قائم ہوا۔ بلوچستان میں پہلا مشاعرہ 1911 میں لورالائی میں یوسف پوپلزئی نے منعقد کیا۔ 1928 میں بزم ادب کوئٹہ میں قائم ہوئی۔ قلم قبیلہ کے نام سے ادبی تنظیم اب تک فعال ہے۔ بلوچستان میں ادبی رسالوں کی عدم دستیابی کے باعث فکشن پنپ نہ سکا۔ حالاں کہ ادب اور ادیب کا اپنا مقام اس کے فکشن میں جھلکتا ہے، مگر بلوچستان میں انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ادبی تخلیقات کرنے والوں کا تعلق کم تعلیم یافتہ ملازم پیشہ افراد سے تھا۔

"اس وقت تک ادبی سرگرمیاں صرف سرکاری ملازمین تک ہی محدود رہتیں۔ وہ محبت، عشق، سلام و پیام تک ہی رہے۔ محض اخلاقی کہانیاں یا عشقیہ شاعری کرتے کہ سر کی سلامتی سے زیادہ انہیں نوکری عزیز تھی۔ ملازمین کو سرکار سے غیر مشروط وفا نبھانا ہوتی تھی۔"

انگریزی فکشن کی بہ نسبت، اردو فکشن کی عمر بہت کم ہے۔ اردو کی کئی اصناف نثر انگریزی ادب کی مرہونِ منت ہیں اور بلوچستان کے اردو فکشن رائٹرز خوف کی فضا میں لکھتے ہیں۔ بلوچستان میں شاعری کی نسبت نثر کو زیادہ پذیرائی نہ مل سکی۔

بلوچستان میں افسانوں کے نام پر اخلاقی کہانیاں لکھی گئیں۔ آغا گل پروفیسر ایس خلیل اور بیگم خورشید مرزا کے افسانوں کو معیاری اور بلوچستانی افسانے تصور کرتے ہیں۔ آغا گل کے نزدیک بالشویک انقلاب، انقلاب فرانس، لینن، کارل مارکس، سگمنڈ فریوڈ، خلافت عثمانیہ کے زوال، 1947 میں تقسیم کی وجہ سے کوئٹہ میں قتل عام، ون یونٹ، 1935 کے زلزلے اور افغان جنگ نے بلوچستان کے دانش مندوں کے سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشی خیالات کو شدید متاثر کیا اور فکشن کا سرمایہ ضائع کر دیا۔

آغا گل لکھتے ہیں کہ تاریخ میں نام اصل ہوتے ہیں اور واقعات جھوٹے، جب کہ فکشن میں واقعات حقیقی اور نام فرضی ہوتے ہیں۔ ملکی سطح پر بلوچستان ہر لحاظ سے وفاق کے ماتحت رہا ہے۔ ادبی لحاظ سے بھی بلوچستان وفاق کا زیر نگوں رہا اور اپنی ادبی شناخت سے محروم ہو گیا۔ جن افسانہ نگاروں کی بلوچستان سے جذباتی اور نسلی وابستگی پائی جاتی ہے ان کے افسانوں سے بلوچستان جھلکتا ہے، جب کہ باہر سے ہجرت کر کے یہاں آنے والے آباد کار افسانہ نگاروں کے افسانوں میں بلوچستانیت عنقا ہے۔

"تقسیم کے بعد ہمارے تمام فکشن کا موضوع ہیرہ منڈی سے نہ ہٹ پایا۔۔۔ عمامہ اور بوٹ پہ لکھنا گویا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔۔۔ بلوچستان میں بھی سرکاری پسند کا فکشن لکھوایا گیا۔ ایسے ادیبوں کو چین کا دورہ، نقد انعامات اور تمغے بخشے جاتے ہیں۔ سرکاری دربار میں عزت ملتی ہے۔ سرپرستی ہوتی ہے۔۔۔ اہلِ بلوچستان صرف اذان دینے یا چائے پینے کے لیے ہی منہ کھولتے ہیں۔ فکشن لکھنے والوں کو بخوبی علم تھا کہ بلوچستان کی سماجی زندگی پر کچھ بھی لکھا تو بے موت مارے جائیں گے۔ لہذا فکشن کا گویا خاتمہ ہوا۔"

بلوچستانی اردو افسانہ نویس انگریزی ادب سے ناواقف ہیں۔ جنسی امتیازات اور مردرخی رجحانات کی وجہ سے عورت کو بلوچستانی افسانوی ادب میں روایتی گھریلو عورت یا قابل فروخت مال کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

"بلوچستان میں Gender Distinction بہت زیادہ ہے۔Male Chauvnism کے باعث خواتین فکشن نگار کرداروں کو چادریں پہنا کر ان کا آدھا دھڑ کاٹ دیتی ہیں۔ خواتین Domestic Violation کا شکار ہیں۔"

"بلوچستانی ادیب مذہب اور جنس کے مابین پنڈولم کی مانند جھوم رہے ہیں۔ وہ حکمران خاندانوں اور سرکاری ٹیلی وژن کے ہاتھوں قلم فروش بن گئے ہیں۔ بلوچستان میں فکشن نگاری دراصل گھر پھونک تماشا دیکھ کے مترادف ہے"۔

حکومتیں اگر فکشن نگاروں کا گلا نہ گھونٹیں تو بلوچستان میں بہترین تخلیق کرنے کی صلاحیت ہے۔ سارتر نے کہا ہے: ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرنا ازحد ضروری ہے، جہاں ادب زندہ ہو۔ ڈیگال سے جب کہا گیا کہ سارتر کو گرفتار کر لیا جائے تو ڈیگال نے جواب دیا کہ سارتر تو فرانس کی آواز ہے میں اسے کیسے گرفتار کر لوں، برطانوی حکومت نے بھی برٹرینڈرسل کو گرفتار کرنے سے انکار ہی کیا۔

آغا گل کے افسانوں کا فکری پہلو

آغا گل بلوچستانی ہیں۔ ان کا اوڑھنا بچھونا بلوچستان ہے۔ وہ بلوچستان کھاتے، پیتے اور بلوچستان کی سانس لیتے ہیں۔ آغا گل کا بلوچستان پاکستان سے زیادہ قدیم، کشمیر سے زیادہ خوب صورت اور مغربی دنیا سے زیادہ مہذب ہے۔ مگر سیاسی شعبدہ بازیوں، مذہبی روایتوں اور معاشی حرص نے بلوچستان کو رہنے کا قابل رہنے نہیں دیا۔ بلوچستان کو تھانے دار کی لاٹھی، ملا کے تعویز، سیاست دان کی چرب زبانی، اشرافیہ کی نفسا نفسی، کسانوں کی بے مروتی، عوام کی جہالت اور افسر شاہی کی عیاشیوں نے میدان جنگ بنایا۔ جب سے پر تھوی اور غوری باہم دست و گریبان ہوئے، تب سے بلوچستان نے اقلیت کی حیثیت اختیار کرلی اور اپنی کسبی ماں کے ہاتھوں اپنے دیگر تین بھائیوں کی طرح گورے صاحب، استاد اور چوکیدار کے ایما پر اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس حادثے کے بعد بلوچستان میں گنوک، سرکک، پوغٹ اور پووپیدا ہونے لگے، مگر بندغ کبھی پیدا نہ ہو سکا۔ بندغ دیکھتا ہے، بولتا ہے اور احتجاج کرتا ہے۔ واپسی پر بندغ گھر کے بجائے سلاخوں کے پیچھے چلا جاتا ہے۔ پھر رہائی کا واحد راستہ اس کا پوو یا سرکک بننا پڑتا ہے۔

بلوچستان کے سماجی نظام میں رحمت اللہ کو رامت اللہ بننا پڑتا ہے، اور سرداری نظام میں رامت اللہ کو گنوک میں تبدیل ہونا پڑتا ہے۔ جن باتوں نے رامت اللہ کو گنوک بنایا، زرا وہ غور سے پڑھ لیں:

"ہمارے ہاتھ اور پاؤں ہمارے سردار اور ہمارے پیر ہیں۔ ورنہ تو وہ ہمیں دیمک کی طرح کھا رہے ہیں۔ جوؤں اور پسوؤں کی طرح ہمارے خون پر پل رہے ہیں۔"

"سردار صاحب! یہ قائد اعظم والا کام اردو والا کام ہے یا انگریزی والا calm ۔ کیونکہ سردار تو کچھ نہیں کرتے۔ ان کے دماغ کو پھر کس کا کارخانہ کہیں گے؟"

"اس سے تو بہتر تھا ٹریکٹر چلاتے ہوئے گاؤں میں آتے۔ روسی بلارس یا امریکی فورڈ اور گاؤں والوں کو تحفہ دے جاتے۔ یا پھر سولر انرجی والا ٹیوب ویل لگا دیتے۔ ایک کنواں ہی کم از کم کھود دیتے۔ چاچا! یہ لوگ بھی عجیب ہیں۔ دیوی دیوتاؤں کو پوجتے

ہیں۔ حالانکہ انھوں نے قیمتی زیور پہن کر تختوں پر بیٹھ کر ذاتی جھگڑوں میں وقت گزارا ہے۔ انسانوں کے لیے کچھ نہیں کیا۔ نہ انھیں زراعت کے طریقے بتائے، نہ میڈیکل سائنس کے بارے میں کچھ بتایا۔ بس اپنی ہی گرہ بندیوں میں پڑے رہے۔ ان کے پجاری ننگے بھوکے رہے، مگر دیوتا ہیرے جواہرات میں لدے پھندے اپنی پوجا کرواتے رہے۔"

"مگر گوتم بدھ نے تاج و تخت چھوڑ دیا انسانوں کیلیئے۔۔۔ کراؤن پرنس بھی تھے۔ اختیارات بھی تھے، وسائل بھی۔ بھوک، بیماری، دکھ سے نپٹنے کیلیئے ایک شفاخانہ کھلوا دیتے۔ ہسپتال بنوا دیتے۔"

چاچا بعد میں رامت اللہ کو کچھ یوں خاموش کراتے ہیں:

"رامت اللہ پتر! تو سچ نہ بولا کر۔ ہمارا خاندان پہلے ہی سچ نے چاٹ لیا ہے۔ پتر تو جھوٹ بولا کر، ورنہ خاموش رہا کر"

اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ سوالات اٹھانے والا اور اپنے حقوق مانگنے والا رامت اللہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے، مگر گنوک بننے کے باوجود ان کو پاگل خانے میں قید کر دیا جاتا ہے، کیوں کہ یہاں نام نہاد عقل سلیم رکھنے والا طاقت ور طبقہ ایک غریب گنوک سے خوف زدہ رہتا ہے۔

گنوک صفت نوجوانوں کے آخری ٹھکانے کا کوئی سراغ نہیں لگتا، البتہ بعض دور اندیش نوجوان اس انجام بد سے بچنے کے لیے عمر بھر سرکک کی زندگی گزارنے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ سرکک کی زندگی کی خصوصیات زرا ملاحظہ ہو:

"ہم تم سب ہی سرکک ہیں۔ اپنے خول میں منہ دیے چپ چاپ چلے جا رہے ہیں۔ زندگی کے دشت و جبل میں کہاں جانا ہے، کیا کرنا ہے، کچھ علم نہیں ہے۔ نہ منزل، نہ راستے، نہ کوئی ارتقا۔ جہاں موڑ، وہاں مڑ گئے۔ سرکک کبھی زادِ راہ نہیں لیتا۔ بس خول ہی اوڑھنا بچھونا ہے۔ ہم بھی اپنے خول میں بند رہتے ہیں۔ کبھی کبھی گردن نکال کر زمین پر نگاہ ڈال لیتے ہیں۔ آسمان پر تو سرکک نگاہ دوڑا ہی نہیں سکتا۔"

گنوک اور سرکک بے قصور ہیں۔ پا، با، سا اور فا (چاروں بھائی، یعنی چار صوبے) بے دست وپا ہیں۔ کیوں کہ ان کی سگی ماں (کسبی) ان کے استحصال میں ملوث ہے۔ ان کی ماں کے کئی شوہر ہیں۔ سارے گورے اس کے شوہر ہیں۔ اگر خدانخواستہ اس کے خلاف کہیں کوئی مزاحمت ہوتی ہے تو ان کو یوں دھمکایا جاتا ہے:

"چند گھنٹے یہ تکلیف اور برداشت کرلو۔ شام کو تمھارے سارے باپ آئیں گے وہ تم سب کا علاج کریں گے۔ بڑی شفا ہے ان کے ہاتھ میں۔"

ان کے علامتی اور مزاحمتی افسانے 'ہابیل قابیل' نے بے انت معلومات کے بیکراں دریا کے ساتھ ساتھ پنجاب اور بلوچستان کے باہمی بے جوڑ رشتے کو بھی اپنے اندر سمویا ہوا ہے۔ اس افسانے میں ہابیل بلوچستان اور قابیل پنجاب ہے۔ ہابیل اور قابیل کا یہ رشتہ معنی خیز بھی ہے اور قابلِ تنقید بھی، مگر ادب میں بلوچستان ازم کی جنم بھومی خلا میں نہیں ہوتی!

"پھر قابیل کا بھائی ہابیل پیدا ہوا اور ہابیل بھیڑ بکریوں کا چرواہا اور قابیل کسان تھا۔" (بائبل سے ماخوذ)

بائبل کی اس آیت سے افسانے کی تشکیل کچھ یوں ہوتی ہے:

"ہاں میرے بیٹے یہ سچ ہے زمیندار اب بھی چرواہے کو مار رہا ہے۔ اس کے پاس ایک کم آدھ درجن دریا ہیں۔ وہ بڑا ہے۔ بجائے چھوٹے بھائی کا محافظ بننے کے وہ اسے قتل کر دینے کے درپئے ہے تا کہ ان ویران بے آباد پہاڑوں پر قبضہ جمالے۔ حرص کی کوئی حد نہیں۔"

آغا گل کے افسانوں پر مقامی جنگوں کے ساتھ ساتھ عالمی جنگوں کے اثرات بھی ہیں۔ فکری لحاظ سے ان کے افسانوں میں جنگ سے نفرت اور امن سے محبت ہے۔ پہلے زمانے میں جنگیں مقامی سطح پر ہوا کرتی تھیں، اور ان کے اثرات بھی محدود ہوا کرتے تھے۔ مگر جب جنگ باقاعدہ انڈسٹری بن گئی تو اس کے اثرات سے بلوچستان بھی محفوظ نہ رہا۔ عالمی جنگوں سے پشتون

اور بلوچ سماج اور ان کا خاندانی نظام کس طرح متاثر ہوا، اس کی بھرپور عکاسی کے لیے ان کے صرف یہ دو افسانے کافی ہیں: 'پہاڑ اور محبت' اور 'چار گل'۔

جدید جنگی قوتوں کی حکمت عملی ہے کہ پہلے نوجوانوں کو ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت محبت سے محروم کرایا جاتا ہے اور بعد میں ان کو اجنبی جنگوں میں دھکیلا جاتا ہے۔ نوجوانوں کو جنگ پر آمادہ کرنے سے پہلے ان کے دلوں سے احساس محبت کو نکالا جاتا ہے، پھر ان کو تحریف شدہ مذہبی لٹریچر پڑھایا جاتا ہے، اور آخر میں انسانی روبوٹ کے ذریعے جنگیں لڑی جاتی ہیں۔ یہاں افغان جنگ لڑنے کے لیے بھی کچھ ایسی فضا تخلیق کی گئی کہ لوگ جوق در جوق اپنی مرضی سے جہاد میں شرکت کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ مجاہدوں کے اعصاب پر غازی بن کر لوٹنا یا شہید ہونا سوار تھا، اور نیا تازہ شادی شدہ عالم خان بھی ان نوجوانوں میں سے ایک تھا۔ جنگ کے دوران میں وہ ایک طویل عرصے تک جیل میں رہا۔ جیل میں انھیں ہمیشہ اپنی جوان بیوی گل غٹی (زڑگیہ) یاد آتی تھی، مگر مقدس فریضہ بھی تو نبھانا تھا۔ عالم خان نے جہاد پر روانہ ہونے سے پہلے اپنی بیوی کی چار گل کو بہ طور یادگار اپنے ساتھ لے گیا۔ اور وعدہ کیا کہ واپسی پر وہ اپنے ہاتھوں سے پہنائے گا۔۔۔ مگر ایک طویل مدت کے بعد واپسی پر زڑگیہ کسی اور کی ہو چکی تھی۔ عالم خان غازی بنا نہ شہید، مگر ملنگ ضرور بنا۔

میرے نزدیک یہ ایک فرضی کہانی نہیں، بل کہ سچی کہانی ہے۔ تقریباً ہر پشتون قبیلہ اس تجربے کا شاہد ہے۔

اسی طرح 'پہاڑ اور محبت' بلوچ سماج کا نوحہ ہے۔ اس افسانے میں نوجوان اور تعلیم یافتہ قادر کے پاگل ہونے کی بنیادی وجہ بیان کی گئی ہے۔ یہ حادثہ کسی بھی کے ساتھ اگر ہو جائے، تو شاید قادر سے بھی بد حال ہو جائے۔ شادی کے دن قادر اور اس کی نئی نویلی دلھن کو اٹھایا جاتا ہے۔ بعد میں جیل، سزائیں اور رہائی ہوتی ہے۔ قادر اور آمنہ ایک دوسرے کے حالات سے بے خبر ہیں۔ اس دوران میں قادر پاگل ہو جاتا ہے، مگر گاؤں والوں کو قادر کے متعلق کچھ علم نہیں۔ قادر کی بیوی کی کسی اور سے شادی ہو جاتی ہے، مگر قادر کو اب بھی آمنہ کا انتظار ہے۔ قادر نے ڈاکٹر کو ایک انگھوٹی دی تھی کہ ڈاکٹر ہونے کے ناطے

آپ کے ہاں عورتوں کی آمد ورفت ہوتی رہتی ہے۔ اگر کہیں سے آمنہ آجاتی ہے تو وہ یہ انگھوٹی ضرور پہچان لے گی، پھر مجھے بتانا۔

مضافات میں ڈاکٹر غنی کہیں کسی مریضہ کے علاج کرنے جاتا ہے۔ اس دوران میں ڈاکٹر کی نظر مریضہ کے ماتھے پر ایک پرانے زخم پر پڑتی ہے، اور پوچھنے لگتا ہے:

"تمہیں یہ زخم کیسے لگا؟"

مریضہ نے آنکھیں کھولیں: "ہمارا گاؤں زبردستی خالی کرایا گیا تھا، ایٹمی دھماکے کے لیے۔ بس لڑائی میں چھوٹ لگ گئی۔ میں جان پر کھیل گئی تھی مگر کچھ نہ بچا۔"

اچانک آمنہ کی نظر انگھوٹی پر پڑتی ہے، اور بدحال ہو کر ڈاکٹر سے قادر کے بارے میں پوچھ لیتی ہے:

"کیا قادر زندہ ہے؟" ڈاکٹر جواب دیتا ہے:

"نہیں! وہ اسی لڑائی میں مارا گیا۔ میں نے بہت کوشش کی، مگر وہ بچ نہ سکا۔"

ڈاکٹر غنی سماجی مصلحت کے تحت راز کو راز ہی رکھ لیتا ہے۔

یہ ایک المیہ افسانہ ہے۔ اس افسانے میں قادر کی شکل میں تمام لاپتہ بلوچ نوجوانوں کا کرب بیان کیا گیا ہے۔ آغا گل اگر ان دو افسانوں کے علاوہ کچھ بھی نہ لکھتے، تب بھی اچھا افسانہ نگار ہوتے!

ان کا افسانہ 'نیا دیس' بھی اس خطے میں صنفی امتیازات کی طرف نشان دہی کرتا ہے۔ اس افسانے میں ستر سالہ حاجی کرم الٰہی خان دولت کے بل بوتے ایک تیرہ سالہ یاسمین سے شادی کر لیتا ہے، مگر ہونا تو وہی ہے جو مقدّر میں لکھا ہے اور یاسمین بالآخر پروفیسر کے ساتھ نئے دیس 'دار الحرب' کی طرف سدھار جاتی ہے۔ حاجی کرم الٰہی خان کو کیا پتہ کہ آج کل کی لڑکیاں دولت

کے بجائے علم کو ترجیح دیتی ہیں۔ حاجی صاحب کٹر مسلمان ہیں اور مغربی دنیا کو دارالحرب قرار دے کر دارالامان یعنی سعودی عربیہ، مراکش، مصر، کویت، بحرین، قطر، لیبیا، شام، یمن اور سوڈان میں جینا مرنا چاہتے ہیں۔ جب حاجی صاحب پروفیسر سے ان ممالک کی بابت پوچھتے ہیں تو پروفیسر اس خوش فہمی کا بھانڈا یوں پھوڑ دیتا ہے:

"سب پر بے رحم حکمران مسلط ہیں۔ فوجی حکومتیں ہیں، حکمران اللہ کے نام پر حکومت کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ شہری حقوق اور بنیادی سہولتیں نہیں ہیں۔ دولت چند لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ نوے فی صد عوام جاہل اور بھوکے ہیں۔ انہیں جاہل رکھا جاتا ہے۔ حکمران انہیں گروہ در گروہ بانٹ بانٹ کے رکھتے ہیں۔ تبھی کوئی انقلاب وہاں نہیں آسکتا۔"

ان کو مسلم دنیا میں انسانی حقوق کی پامالی پر بالعموم اور پاکستان میں انسانوں کے ساتھ حیوانوں جیسے سلوک پر خصوصاً دکھ ہوتا ہے۔ ادب میں چوں کہ ان کا موضوع بلوچستان ہے تو بلوچستان میں وہ ایٹمی دھماکوں کو اس جغرافیے کا زوال ٹھہراتے ہیں۔

اسی طرح 28 مئی 1998 کو راسکوہ کے مقام پر جب زرخیزی اور افزائش کی دیوی کا ہیبت ناک قتل ہوا، تب سے بلوچستان تہذیب و تمدن سے کئی نوری سالوں کے فاصلوں پر رہ گیا۔ بلوچستان کا رابطہ تب سے دانش و تدبر سے کٹ گیا جب سے کبھی ماں نے سچے لکھاریوں کو اسفل سافلین اور خوشامدیوں کو عرش تک پہنچایا۔ بلوچستان کے انداموں پر اس وقت رعشہ طاری ہونا جاری ہوا جب سے اس نے غربت، افلاس، لاچاری، اور بیماری کو عطیہ خداوندی قبول کرنے سے انکار کیا۔ بلوچستان میں قدرتی آفات نے اس وقت انسانی آفات سے ملی بھگت کی جب یہاں کے باسیوں نے تعلیم اور ٹیکنالوجی پر کھیت کھلیان کو زیادہ اہمیت دی۔ اور بلوچستان میں اس دن سے سورج نے نکلنا چھوڑ دیا جس دن سے زبانوں کی سزا لاشوں کو دینا شروع ہو گیا۔ بلوچستان میں پھول مرجھا جائے یا پتوں کا ہلنا بند ہو جائے، بہتا پانی رک جائے یا گندم اگنا بند کر دیں، خاموشیاں ساتویں زمین تک سرایت کریں یا آہیں ساتویں آسمان کو دہلائیں، زر کی تفریط ہو جائے یا زور کی افراط ہو جائے، اور بے غیرتی کو غیرت سے مسمیٰ کیا جائے یا غیرت کو کمزوری سمجھا جائے - یہ سب آغا گل کی تخلیقات کے موضوعات ہیں۔ آغا گل کا افسانہ سیاہ کار بلوچستان میں اس معکوس سفر کی روداد ہے۔ جس میں باری سے صلح کے باوجود بدلہ لینے کے لیے مقتول کا بھائی شربت

نہ صرف باری کا قتل کرتا ہے، بل کہ بعد میں عدالتی کارروائی اور جیل کی جھنجھٹ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے شربت اپنی بے گناہ اور حسین بیوی بختو کو بھی قتل کر دیتا ہے، اور اعلان کرتا ہے کہ چونکہ سیاہ کاری کا معاملہ تھا اس لیے باری اور بختو دونوں کو قتل کر دیا گیا۔

معاملہ یہاں ختم نہیں ہوتا۔ شربت کو ہیرو پیش کیا جاتا ہے، ان کے ہاتھ، پاؤں، لباس اور جوتوں کے بوسے لیے جاتے ہیں، اور ان کو کندھوں پر اٹھایا جاتا ہے۔۔۔ یہ ہے ہمارا سماج!

جس کے ساتھ معمولی رنجش آجائے، یا کوئی ناپسندیدہ ٹھہرے، اس کو مارو اور بڑی آسانی سے سیاہ کاری یا بلاسفیمی کا الزام لگاؤ۔۔۔ سزا کی جھنجھٹ بھی ختم، اور غازی کا نام بھی کماؤ۔

بلوچستان میں تعلیمی حالت زار ہو یا دفاتر میں آفیسروں کی رعونت، پوسٹ آفس میں ڈاکیوں کی نفسا نفسی ہو یا عام عوام کی کسر نفسی، سڑکوں کی حالت زار ہو یا فاقوں کی بہتات، اور حوالداروں کی من مانی ہو یا قیدیوں کی مظلومیت –یہ سب ان کے افسانوں کا قصہ ہیں۔ ان کے افسانوں کے خام مواد گوشہ نشینی میں نہیں چہل قدمی میں، امیری میں نہیں غریبی میں، شہروں میں نہیں دیہاتوں میں، امن میں نہیں جنگوں میں، علم میں نہیں جہل میں، نفع میں نہیں نقصان میں، اور پاکستان میں نہیں بلوچستان میں موجود ہیں۔ بلوچستان میں صرف کوئٹہ ہی اعلیٰ پائے کا شہر ہے جہاں بلوچستانی عوام اپنی نئی نسل کو حصول تعلیم کے لیے بھیج دیتے ہیں، مگر جب سے کوئٹہ خون کا کھیت (حقل دما) بنا اور نوجوانوں کو نگلنا شروع کیا، تب سے پر امن دیہاتیوں نے شہروں کا رخ چھوڑ دیا ہے۔ ان کا افسانہ 'جھنڈا بازی' کئی حوالوں سے اہمیت کا حامل ہے، یعنی جوانوں کا بے وقت اور معمولی معمولی مقاصد کے لیے سیاست دانوں کے ہتھے چڑھ جانا، عوام کو حکومت کی جانب سے بنیادی سہولتوں کی فراہمی کے بجائے جھنڈے فراہم کرنا، عوام کو سرِعام حبّ الوطنی پر مجبور کرنا اور جوان طالب علموں کو شک کی نگاہ سے دیکھنا—یہ سارے موضوعات اس افسانے سے اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ مگر افسانے کے آخر میں کیا گیا مکالمہ دردناک اور ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے:

باس:"یہ فریم میں جھنڈا دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی ہے۔"

آزات نے چائے کی چسکی لی، فریم پر نظر ڈالی اور خاموش رہا۔

"یہ فریم آپ مجھے تحفہ میں دے دیں۔" باس چہکا۔

آزات نے ندامت سے کہا:"آپ یہ میرا گھر لے لیں، مگر میں یہ فریم دینے سے قاصر ہوں۔"

باس:"نہیں دے سکتے؟، وہ کیوں؟"

آزات:"میرا بیٹا الیاس نذر یونیورسٹی میں پڑھتا تھا، اسے اٹھالیا گیا تھا۔ پھر اس کی مسخ شدہ لاش ہی ملی۔ یہ جھنڈا اس کی جیب میں تھا۔"

ان کے افسانوں میں چند الفاظ اتنے تواتر کے ساتھ دہرائے گئے ہیں کہ ان الفاظ کے پس منظر سے ان کی فکر کا سراغ بآسانی لگایا جاتا ہے۔ پشتون قوم، بلوچ قوم، گورے، تاج برطانیہ، انا کونڈا، دو قومی نظریہ، کالونیل نظام، ڈاک خانہ، ریلوے لائن، سرمچار، پہاڑ، واہگہ بارڈر، چمن بارڈر، سردار، نواب، استحصال، قبضہ، تقسیم، فوج، پنجابی، آبادکار، ڈومیسائل، مہاجر، رفیوجی، اغوا، قتل، دھماکا، لاش، بھوک اور بیروزگاری—یہ تمام وہ الفاظ ہیں جن کی میگنیٹک فیلڈ سمجھنے کے بعد ہی ان کے فکری زاویوں سے شناسائی ممکن ہے۔

جس طرح عطاشاد کے بلوچستان میں ایک کٹورے پانی کی قیمت سو سال وفا ہے، اسی طرح آغا گل کے بلوچستان میں ایک گرام سونے کی قیمت ایک لاش ہے۔ یہاں ترقی خوشامد میں اور تنزل سچ میں ہے۔ یہاں کے لوگ روٹی، کپڑا، مکان اور تعلیم سے ناواقف ہیں۔ وہ مٹی کھاتے، پیتے اور مٹی کی سانس لیتے ہیں۔ یہاں نیچر کے قوانین غیر موثر ہیں۔ یہاں رات دن، ماہ وسال، بہار وخزان، زندگی اور موت یعنی سب کچھ طاقت ور طبقوں کی ذاتی پسند وناپسند کے تحت وقوع پزیر ہوتا ہے۔ یہاں نیوٹن کے قوانین حرکت، ڈارون کا نظریہ ارتقا اور اسلامی نظریہ حیات کے بجائے بوٹ کے قوانین حرکت، بندوق کا نظریہ ارتقا

اور فوجی ضابطہ حیات لاگو ہیں۔ یہاں مذہب پر ملا، سیاست پر سردار، معیشت پر اشرافیہ، سماج پر انتہا پسندوں، تعلیم پر جہلا، اداروں پر بدعنوان عناصر، صحت پر قصائی اور حکومت پر محافظوں کا قبضہ ہے۔ بلوچستان میں اردلی حجام اور حجام استاد کا کام کرتا ہے۔ نیکو جو تاچور ہے اور جو تاچور کو سزا دینے والا مجاہد اعظم ہے۔ دشمن باہوٹ بنا دندناتے پھرتا ہے اور قاتل غیرتی کا لقب پاتا ہے۔ مقامی روایات سے مذاہب بنتے ہیں اور مذاہب سربازار رسوا ہوتے ہیں۔ یہاں پانی کے ٹینکروں سے زیادہ جنگی ٹینکوں کی تعداد پائی جاتی ہے۔ بلوچستان کے لوگ تیل سے زیادہ پانی کے لیے ترستے ہیں اور مویشیوں سے زیادہ اموات انسانوں کی ہوتی ہے۔

بلوچستان میں پانی کی قلت اور اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ بلوچستان میں کئی مقامات آب یعنی پانی کے نام سے مسمیٰ ہیں؛ مثلاً: وش آب، نخل آب، آبِ گم، مشکِ آب، سرِ آب، شیرین آب، وغیرہ۔

آغا گل کی نظر میں تقسیم نے ہندستان اور پاکستان پر اتنے خوفناک اثرات مرتب نہیں کیے جتنے خوفناک اثرات بلوچستان کی تہذیب و ثقافت پر اس کے پاکستان کے ساتھ الحاق کی وجہ سے پڑے، اور ایٹمی دھماکوں کے لیے بلوچستان کی سرزمین کے انتخاب نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ آغا گل نے افغان جنگ کے پشتونوں کی سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی پر منفی اثرات کا خاکہ بھی اپنے افسانوں میں خوب کھینچا ہے۔ جیسا کہ پریم چند، کرشن چندر، منٹو اور راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کی بہتر تفہیم کے لیے برصغیر کی تقسیم یا بٹوارہ کے دور کے سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی حالات سے ازحد شدبد لازمی ہے، اسی طرح آغا گل کے افسانوں کو بہتر سمجھنے کے لیے بلوچستان کی قدیم تہذیب و تمدن، لسانی امتیازات، سماجی روایات، سیاسی جبر اور مذہبی جبر سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ ان کے افسانے محض تفریح طبع کے لیے نہیں ہیں، بل کہ بلوچستان کی سطح پر مسخ شدہ حقائق سے آگہی کے لیے بھی پڑھے جاتے ہیں۔ ان کے افسانے جنسی ابال کے بجائے ذہنی ابال کا سبب بنتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں پہلے سیر و تفریح، پھر اضطراب و ہنگامہ اور آخر میں ابدی سکون ہوتا ہے۔ ان کے فن میں بلوچستان کی طرح محبت، امید اور سکھ بھی بانجھ نظر آتے ہیں۔

افسانہ زندگی کا ادبی نقش ہے۔ اردو میں مختصر افسانے کی عمر تقریبا120 سال تک کی ہے۔ اردو افسانہ بیسویں صدی کی پیداوار ہے۔ افسانہ زندگی کی عکاسی، تشریح اور تعبیر ہے۔ اس عکاسی میں کون کس پر زیادہ سبقت لے جاتا ہے اور کون اس کام میں زیادہ کامیاب ہو جاتا ہے، وہ کامیاب افسانہ نگار کہلاتا ہے۔ اس ضمن میں آغا گل ایک کامیاب افسانہ نویس ہیں۔

آغا گل نے بلوچستانی زندگی کی وہ تصاویر پیش کی ہیں جو ان کو ناپسندیدہ ہیں۔ ان کے افسانوں میں تاریخی فضا کے ساتھ ساتھ ڈرامائی اور داستانی فضا بھی موجود ہے، جب کہ ان میں شعریت اور رنگینی نہیں ہے۔ ان کا بنیادی تصور حُبِ بلوچستان، بلوچستان کا تمدن اور آزادی کی جدوجہد ہے۔ آغا گل کے افسانوں کی اہمیت بلوچستان کی سماجی اور معاشی پست حالی، حقیقت نگاری، بے باک تاریخ نگاری اور سیاسی جدوجہد کی وجہ سے ہے۔

جس طرح موضوعات کے لحاظ سے ہندستان اور پاکستان کے افسانوی ادب میں فرق ہے، اسی طرح پاکستان کے دیگر صوبوں اور بلوچستان کے افسانوں میں بھی فرق محسوس کیا جاسکتا ہے۔ بلوچستانی افسانوں میں بڑی حد تک سماجی، معاشی اور سیاسی عدل سے محرومیت کی صورت گری کی گئی ہے۔ بلوچستان میں کئی پیچیدہ مسائل ایک بڑے عرصے سے حل طلب رہے ہیں جس کی وجہ سے زبان پر بے پناہ دباؤ پڑا ہے اور تحریر میں تحمل اور برداشت کی کمی بھی آئی ہے۔ اس ضمن میں آغا گل کے افسانوی مجموعے بلوچستان کی سماجی، معاشی اور سیاسی تاریخ پر تحقیقی کتب کی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ افسانہ یا تو تاثر (تخیل) سے جنم لیتا ہے یا تاریخ (واقعہ) سے، بلوچستانی افسانوں نے بالعموم اور آغا گل کے افسانوں نے بالخصوص تاریخ سے جنم لیا ہے۔

کسی بھی جغرافیے میں سیاسی جدوجہد دراصل علمی جدوجہد کے بعد جنم لیتی ہے۔ لیکن بلوچستان میں علم شجر ممنوعہ ہے۔ آج کل سائنس اور ٹیکنالوجی نے حصول علم کو نہایت آسان بنایا ہے، مگر یہاں انٹرنیٹ پر پابندی اور تعلیمی اداروں میں مسلسل جنگی ماحول کی موجودگی کی وجہ سے عوام کو بے تعلیم رکھا جاتا ہے۔ یوں تو شعور اور علم انسان کی میراث ہے، جہاں سے اور جس ذریعے سے ممکن ہو، حاصل کر سکتا ہے۔ علم اور ذرائع علم پر بندشیں لگانے کا علامتی خاکہ 'کماش' میں یوں کھینچا گیا ہے :

"یہ ہے کماش۔ یہ ہے سارے فسادات کی جڑ۔ گرفتار کرلو اس کو۔ ہتھکڑیاں ڈال دو اس کے ہاتھوں میں۔ اس کی مسخ شدہ لاش پھینک دو ویرانوں میں۔"

یہ کماش ٹیلی وژن ہے، جس کے ذریعے عوام کو حالات سے مسلسل آگاہی ہوتی ہے۔ ٹیلی وژن کو کیوں گرفتار کیا جاتا ہے، یہاں اس کا قصور ملاحظہ ہو:

"جب کوئٹہ کراچی روڈ بنا تو ان دنوں سبھی قسمت پر قناعت کیا کرتے تھے۔ وہ اپنی غربت، افلاس، لاچاری اور بیماری کو عطیہ خداوندی سمجھتے۔ پھر یہاں سڑک کے ساتھ ساتھ ہوٹل کھلنے لگے۔ انہوں نے ڈش لگالی۔ ٹیلی وژن پر باقی دنیا والوں کو، باقی علاقوں کو دیکھ کر لوگ باولے ہونے لگے۔ وہ اپنا مقابلہ باقی دنیا سے کرنے لگے۔ ان کا دماغ جاگ اٹھا۔ بھوک اور غربت سے مرنے کے بجائے انہوں نے گولی سے مرنا پسند کیا۔ صحراؤں میں بے گوروکفن مرنے کو ترجیح دی۔ نہ کفن کا خرچہ اور نہ ہی گورکن کی مزدوری۔ یہ ٹیلی وژن گرفتار کر کے قلعہ میں لے جاؤ۔ دوبارہ یہاں امن آجائے گا۔ تھانہ سوناخان سے حلب چوکی تک امن ہی امن ہو گا۔"

زندگی اور ان کے حقائق کو گرفت میں لانا اور ان کو پوری طرح فنی سانچے میں ڈھالنا، ایک کامیاب افسانہ نگار ہی کر سکتا ہے، ورنہ زرا سی لغزش سے پروپیگنڈا تشکیل پاتا ہے۔ آغا گل کے افسانے شعوری عمل کے تحت واقع ہوتے ہیں، یعنی ان کے اعصاب ان کے بس میں ہیں۔ جس شخص کے بس میں اس کے اعصاب نہیں ہیں اس کا عمل غیر شعوری ہوتا ہے۔ اعصاب کو بس میں رکھنے والا شخص ہر واقعے کو اپنے شعور کے ترازو پر تولتا ہے اور پھر اپنے شعور کو جس طرف لے جانا چاہتا ہے، لے جا سکتا ہے۔ ورنہ لاشعوری طور پر مستند تاریخی واقعات کو افسانے کے فن میں مدغم نہیں کیا جا سکتا۔

آغا گل کے افسانے خلا میں نہیں لکھے گئے اور نہ ہی ان کے موضوعات مابعد الطبیعات سے کوئی علاقہ رکھتے ہیں۔ وہ زمین پر بھیڑیے نما انسانوں اور جانور صفت آدم زادوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے افسانے اسی زمین پر گزرنے والی زندگی کے متعلق ہیں۔ دوسری بابری مسجد، پیاز، مسیت ناپاٹ، پرتھوی غوری، حقل دما، پوسکنگ خنک، ڈاک پہ ڈاکہ، کماش،

پہاڑ اور محبت، چار گل، اور دیگر جیسے لاثانی افسانے لاشعوری طور پر خلا میں تخلیق نہیں ہوتے، ان کا ایک مخصوص پس منظر ہوتا ہے۔

دوسری بابری مسجد رومان اور حقیقت کا امتزاج ہے۔ جس میں مسلمان لڑکا بابر اور ہندو لڑکی شیلا ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ بابر سے ان کے سیال یعنی کزن (بیبرگ) کی خاندانی اور مالی چشمک ہوتی ہے، اور کسی طریقے سے بابر کو مارنا چاہتا ہے۔ بابر شیلا کے کوچے کا چکر لگاتا ہے۔ ہندو مسلم فسادات عروج پر ہوتے ہیں۔ بیبرگ شام کے ملگجے اندھیروں میں بابر پر اسی کوچے میں چپکے سے فائر کھول دیتا ہے، اور بابر سخت زخمی ہو جاتا ہے۔ بیبرگ افواہ پھیلاتا ہے کہ ہندوؤں نے مسلمان بابر کو مارا ہے۔ حالات کنٹرول سے باہر ہوتے ہیں۔ بابر اسپتال میں زیر علاج ہے۔ بالآخر شیلا کماری کی عقل مندی کام آجاتی ہے، بیبرگ اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ افسوس کہ بابر زخموں کا تاب نہ لا سکا، اور اس کے سوئم پر شیلا کماری بھی نہ رہی۔ شیلا کی یاد میں صرف ایک دن گرلز کالج بند رہا، باقی زندگی جوں کی توں چلتی رہی۔

یہ ایک چھوٹی سی ٹریجیڈی ہے۔ بڑی ٹریجیڈی یہ ہے کہ بابر کی یاد میں دوسری بابری مسجد کی تعمیر کا اعلان کیا جاتا ہے، مگر بابر کے تعلیم یافتہ والد کی دانش مندی کام آجاتی ہے کہ: مسجدیں ضرور بنائیں، مگر اس دھرتی پر اب دوسری بابری مسجد نہ بنانا!

اس افسانے کی اصل محرک آغا گل کے بچپن کی ہندو محلے سبی میں شیلا کماری سے ناکام محبت ہے۔ زندگی میں محبت ضروری ہے: کامیابی کی صورت میں خوش گوار ازدواجی زندگی ملے گی اور ناکامی کی صورت میں تخلیقی ادب ملے گا۔

'تحفہ 'بلوچستان یونیورسٹی سے لاپتہ افراد کی کھتا ہے۔ آغا گل کے نزدیک یہ دنیا کی واحد یونیورسٹی ہے جس پر سپاہیوں کا قبضہ ہے۔ اس افسانے میں شانتل کا بھائی نذر بلوچستان یونیورسٹی کے ہاسٹل سے لاپتہ ہوتا ہے۔ شانتل نذر کی بازیابی کے لیے پولیس آفیسر عمران سے توقعات وابستہ رکھتی ہے، جب کہ عمران کی نیت میں فتور ہے۔ عمران شانتل کو قیمتی تحفے دلانے

سے اس کا دل جیتنا چاہتا ہے، مگر شانتل نذر کے غم سے نڈھال ہے۔ شانتل کہاں اور محبت کہاں۔ یوں شانتل تحفے قبول کرنے انکار کرتی ہے، اور عمران سے زندگی کا آخری تحفہ مانگ لیتی ہے: اپنے لاپتہ بھائی نذر کی لاش!

"اس کا یہی حل ہے کہ مجھے نذر کا مردہ جسم دو، مجھے اس کی لاش دو، یہی میرا عید کا تحفہ ہو گا، کیوں کہ اسے دفن کر کے میرا خاندان اذیت و عذاب دہ انتظار سے نکل جائے گا۔"

جب زندگی میں بیٹے، شوہر، باپ اور بھائی کی لاش عید کا تحفہ ٹھہرے، تو اس زندگی سے موت اچھی ہے اور پیدا ہونے سے نہ پیدا ہونا بہتر ہے۔

آغا گل اپنے افسانے پیاز میں غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے والے محب وطن بلوچ کسانوں کے استحصال کا خاکہ کھینچتے ہیں، کہ کس طرح ایک محب وطن گہرام آخر کار پاکستان کا جھنڈا اتار دیتا ہے۔ یہ افسانہ اپنے اصلی معنوں میں مستند تاریخی واقعے کا پرتو ہے۔ اگر گہرام بھی باغی ہو سکتا ہے تو کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ جب اپنوں کے عقائد، اصول، اعتماد، محنت اور حب الوطنی سے زیادہ غیروں کی پیاز اہمیت اختیار کر جائے، تو گہرام بننا چند ساعتوں کا کھیل ہوتا ہے۔

مسیت ناپاٹ بھی دراصل تقسیم سے متعلق تاریخی واقعات کا ایک حوالہ ہے۔ جس میں خاندانوں کے منتشر ہونے کی کھتا بیان کی گئی ہے۔ یہ انسانی وجود کو بوجھل کر دینے والا افسانہ ہے۔ عطا اور بالی کا ملنا، اور کہانی کا اختتام ہونا بہت کرب آمیز ہوتا ہے۔ تقسیم نے بھائی اور بہن کو آخر کس نہج پر پہنچایا، کتنی پاک دامن بیٹیوں اور بہنوں کو طوائف میں تبدیل کیا اور کتنی مقدس تہذیبوں کو پلید کر دیا۔ یہ حقائق افسانوی ادب کے سوا اور کہیں نہیں ملتے۔

ایک اور افسانے 'ماجو' میں بھی یہ ذکر کیا گیا ہے کہ کس طرح پاک دامن بیٹیاں طوائف بن جاتی ہیں۔ ماجو کے گھر پچاس ہزار بجلی کا بل اور اسی طرح ایک اور ناقابل برداشت گیس کا بل بھی آتا ہے۔ جب ماجو متعلقہ آفیسر سے بل میں ریلیف کی بابت ملتی ہے تو آفیسر ماجو سے کہتا ہے کہ تم مجھے وقت دے دو میں تمھارا بل ختم کروں گا۔ پہلے تو ماجو انکار کرتی ہے، مگر گھر میں

مسلسل اندھیرا ہونے کی وجہ سے بالآخر ماجو نچھاور ہو جاتی ہے اور بل کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ دراصل بل سے چھیڑ چھاڑ اسی آفیسر نے کیا تھا۔ افسانے دراصل وہی ہوتے ہیں جو اشرافیہ کو بے لباس کر دے۔

'پوسکنگ خنک' افسانے میں بلوچستان میں مسلسل احتجاج، مظاہرے اور ہڑتالوں کو جواز فراہم کیا گیا ہے کہ عوام کو آمدورفت کے لیے پکی سڑکیں، پینے کے لیے صاف پانی، آبی ذخیرے کے لیے بندات، ذریعہ معاش کے لیے زراعت کی بحالی، خوش حال زندگی گزارنے کے لیے روزگار کے مواقع اور امن کی ضرورت ہے۔ آج بھی وہی بلوچستان، وہی مسائل اور وہی مظاہرے، اگر کمی ہے تو صرف ملنگ بابا کی کمی ہے۔ وہ ملنگ بابا، جس کا تکیہ کلام تھا: پوسکنگ خنک۔

ملنگ بابا مریخ سے نہیں اترتے اور نہ ہی زمین سے نکلتے ہیں، ہر کوئی ملنگ بابا بن سکتا ہے اگر وہ ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر عوامی مفادات کا خیال رکھیں۔ اس افسانے میں ایک مہذب بے لوث سماجی رہنما اور خدائی خدمت گار کے لیے ملنگ بابا کی علامت استعمال کی گئی ہے۔

بلوچستان میں نہ صرف مہذب سیاست کی کمی ہے، بل کہ باوقار محبت بھی معدوم ہے۔ آغا گل محبت کو خود پر قربان نہیں کرتے، بل کہ خود کو محبت پر قربان کر دیتے ہیں۔ محبت کیا ہے اور کیا نہیں ہے، یہ ایک Relative Subject ہے، مگر بلوچستانی محبت یہ ہے کہ محبت کرنے والے یعنی عاشق کی زندگی سے زیادہ اہم معشوق کی زندگی ہے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر معشوق کے خاوند کی زندگی بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ افسانہ 'ھلی' میں نبو کا زباد کے لیے شامیر کو بچانا اور ناکردہ جرم کو اپنے نام کر کے ھلی کو ہمیشہ کے لیے خون آلود گلے لگانا محبت کی انتہا ہے، اور شاید پاگل پن بھی ہو۔ آغا گل کے افسانوں میں یہ پیاسی رومانیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ گمان کیا جاتا ہے کہ اس قسم کے افسانوں پر ان کی عملی زندگی کی چھاپ ہو، مگر گمان اچھی کیفیت نہیں۔

سپیڈ بریکر بہ ظاہر ایک معمولی افسانہ ہے، مگر اس میں بیمار ذہنیت کے حامل سماج کا زبردست مذاق اڑایا گیا ہے۔ ایک عام غریب ان پڑھ دہاڑی دار مزدور دراخان سے ڈی کے ناز کس طرح بنتا ہے، پھر اس کے کیا کیا نخرے ہوتے ہیں اور آخر میں

اس کے نخروں سے ہوا کیسے نکل جاتی ہے–یہ اس افسانے کا موضوع ہے۔ دراخان جب ڈی کے ناز بنتا ہے تو بے چارے ان پڑھ کی دیگر تھرڈ کلاس خواہشات میں سے ایک خواہش اپنے گھر کے سامنے اسپیڈ بریکر بنانا ہے، سو بنالیتا ہے۔ بعد میں علاقے کا کمشنر تمام غیر قانونی سپیڈ بریکرز کے خلاف کارروائی کا حکم دیتا ہے، یہ ڈی کے ناز کی انا کا مسئلہ بنتا ہے۔ سڑک کو بلاک کر دیا جاتا ہے، خوب احتجاج ہوتا ہے، نعرے بازیاں ہوتی ہیں اور سارا علاقہ ڈی کے ناز کی حمایت اور سرکار کی مخالفت میں نکل آتا ہے۔ سرکاری آفیسر پڑھا لکھا بندہ ہے، عوام کا نبض شناس ہے اور ڈی کے ناز سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

"اسپیڈ بریکر پس ماندگی کی علامت ہے۔ ہم زندگی اور وقت کی رفتار کو روکنا چاہتے ہیں۔ اسے سست رفتاری پر مجبور کرنا چاہتے ہیں۔ شہروں میں جتنے زیادہ اسپیڈ بریکر ہوں گے، لوگ اسی قدر زیادہ پس ماندہ ہوں گے۔۔۔ شہریوں کی حفاظت اسپیڈ بریکر سے نہیں، بلکہ ان کی ذہنی مستعدی اور عملی استعداد سے ہوتی ہے، ورنہ کچھوا تو مضبوط ترین خول میں بھی مر جاتا ہے۔ سارے بریکرز توڑ ڈالیں۔ شہری محتاط، پابند، ہوشیار اور چوکنا ہو جائیں گے۔ یہ بریکرز نہیں، ناروا تحفظ کا احساس ہے۔ یہ ہماری انا کی لاشعوری تسکین ہے۔ اسپیڈ بریکر علامیہ ہے، جہالت کا، شہریوں کی ذہنی پس ماندگی، خوف کا، جب کہ خوف کی جبلت حیوانیت ہے۔ کب تک ہم حیوان بنے رہیں گے۔ بلوچستان بھر کو ان اسپیڈ بریکر سے نجات دلائیں اور متمدن قوموں کی صفوں میں لا کھڑا کریں۔ مجھے یہی کہنا تھا۔ شکریہ باقی فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔"

پھر ہوا یوں کہ ڈی کے ناز نے خود ہی بریکر کو ختم کر دیا۔ انھوں نے اپنے اکثر افسانوں میں ضمیروں کو جھنجھوڑا ہے–خواہ یہ ضمیر مرد کا ہو یا عورت کا، حاکم کا ہو یا محکوم کا اور اشرافیہ کا ہو یا مفلس کا۔ جو کاٹ لفظوں میں ہوتی ہے وہ چھڑی اور بندوق میں کہاں! بلوچستانی ان پڑھ، غریب، انا پرست اور مزاحمتی ضرور ہوں گے، مگر گفت و شنید، ڈائیلاگ اور مصالحت کی زبان بھی سمجھتے ہیں۔ یہاں تو زبان کے استعمال سے پہلے ہی ہتھیار کا استعمال ہوتا ہے۔ زبان سیاست دانوں اور اعلی آفیسروں کا زیور ہے، جب کہ بندوق عسکری طبقے کا ہتھیار ہے۔ فی زمانہ بلوچستان میں بندوق زبان پر حاوی ہے اور نتیجہ سب کے سامنے ہے۔

آغا گل نے اس کے علاوہ کوئٹہ والوں کی سادگی کو لومڑی شہزادی اور کوئٹہ میں ہاتھی جیسے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ ڈاک خانے کے نظام کو انقلاب، ڈریکولا، ڈاک پہ ڈاکہ، گوانکو، بوانٹو، ڈاک اور حجامت، اور ڈاکخانہ ککڑ کے ذریعے پیش کیا ہے۔ جیل کے اندرونی ماحول کو غیرتی، لازوال محبت کی کہانی کو معمورہ فرنگی اور لاپتہ افراد کی نمائندگی کو 'حقل دما' کے ذریعے خوب تر انداز میں کی ہے۔

اکثر اوقات ان کے افسانے اور ناول پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آغا گل ایک کٹر قسم کا ریاست مخالف شخص ہوں گے، مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ وہ خود ایک ذمے دار بیوروکریٹ رہ چکے ہیں۔ ان کو بہتر معلوم ہے کی تبدیلی کیسے اور کس چیز کے اپنانے سے آسکتی ہے۔ افسانہ 'ھلی' کا یہ اقتباس پڑھنے کا لائق ہے:

"تم نے غلط پٹری اکھڑی ہے۔ ٹرین دوسرے ٹریک سے آرہی ہے اور ایک پٹری سے کیا ہوتا ہے، چٹان سے لڑنے کے لیے چٹان جتنی طاقت چاہیے۔ پہلے اس قدر طاقت ہمیں پیدا کرنا ہوگی۔۔۔ علم، دولت، سیاست جو انگریزوں کے ہتھیار ہیں۔ ہمیں بھی یہی ہتھیار استعمال کرنے ہوں گے۔ ایک طویل جنگ کی تیاری کرو، اگر ہم متحد اور باشعور ہوتے تو کیا مجال انگریزوں کی۔ جاؤ! یہاں اندھیرے میں اس فرسودہ ڈھاڈری بندوق سے لڑنے کے بجائے جنگ کے، آزادی کے لیے بہتر نسلیں تیار کرو۔"

انھوں نے فرضی کہانیوں کے بجائے حقیقی واقعات کو کئی فنی مراحل سے گزار کر افسانوں اور ناولوں کی تشکیلِ نو کی اور نئے لکھنے والوں پر یہ واضح کیا کہ حقیقی واقعات سے بھی بڑا ادب جنم لے سکتا ہے۔ آغا گل کے طرز پر لکھنے سے ادب میں کسی بھی جغرافیے کے اصل اور خالص تہذیب و تمدن کا سراغ بھی لگایا جاسکتا ہے اور مسخ شدہ اصل تاریخی حقائق سے شناسائی بھی ہوسکتی ہے۔

ان کا فکر و فن زمان و مکان کا پابند ہے۔ وہ سارے جہان کا درد اپنے جگر میں نہیں رکھتے۔ کیوں کہ وہ خود حالات کی ستم ظریفی کا مارا ہوا ہے اور اب اپنے دکھوں کے لیے مداوا کی تلاش میں ہیں۔ وہ طرابلس، بلقان، ویت نام، کشمیر، فلسطین، یمن،

افغانستان، عراق اور دیگر عالمی جنگوں اور مسائل سے سروکار صرف معلومات کی حد تک رکھتے ہیں، مگر ان کی ادبی توجہ بلوچستان پر ہے۔ وہ آفاقیت کے غبار اور نام نہاد انسانیت کے پرچار پر بلوچستانیت اور بلوچستانیوں کو قربان نہیں کرتے، اور نہ ہی مفرّس، معرّب اور مہنّد اردو کے مقابلے میں بلوچستانی اردو کو دیوار سے لگاتے ہیں۔ وہ فکری عالمگیریت کی آڑ میں اسلامی آثار واثرات کے ملبے تلے بلوچستانی تہذیب و تمدن کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ اور اسی طرح وہ پاکستانی ادب کے فروغ اور حبّ الوطنی کے سرابوں میں اپنی صوبائی پہچان کو زنگ بھی نہیں لگاتے۔ وہ برصغیریات اور ہندستانیات کے برعکس بلوچستانیات کے پرچارک ہیں۔ بلوچستان ازم کی اس تگ ودو سے ان کی تحریروں میں فکری یک رنگی بھی در آئی ہے۔ یہ ادبی یک رنگی شاید بلوچستان کی سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشی یک رنگی کا پرتو ہے۔

پاکستان کی عمر اپنے جغرافیائی، قومی اور ادبی تشخص کے اعتبار سے صرف چھہتر سال ہے، جب کہ بلوچستان کا جغرافیائی اور ثقافتی تشخص صدیوں پرانا ہے۔ حقیقت میں پاکستان تاریخی شعور جب کہ بلوچستان جغرافیائی شعور کا نتیجہ ہے۔ جغرافیائی شعور سے تاریخی شعور میں اتنی تبدیلی نہیں آسکتی جتنی بڑی تبدیلی تاریخی شعور سے جغرافیائی تبدیلی میں آسکتی ہے۔
بلوچستان کے ضمن میں اگر دیکھا جائے تو یہ کہنا بجا ہو سکتا ہے کہ تاریخی شعور نے جغرافیائی شعور پر فوقیت حاصل کرلی ہے۔ جس کے نتیجے میں تاریخ جغرافیے پر مسلط ہو گئی ہے اور بلوچستان کا علاقائی تشخص، خدوخال اور کلچر شکست وریخت سے دوچار ہو گیا ہے۔ بلوچستان کو اس بکھراؤ سے بچانے اور جغرافیے کو تاریخ پر فوقیت دینے کے لیے آغا گل نے افسانوی ادب کو اپنا ہتھیار بنایا۔

آغا گل کے ہاں اکثر اوقات تہذیب، تاریخ اور افسانہ ایک دوسرے کے ساتھ برسرپیکار نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے آغاز میں تہذیب، عروج میں تاریخ اور آخر میں تہذیب اور تاریخ دونوں پر افسانے کا فن سبقت لے جاتا ہے۔ اسی سبقت نے آغا گل کو ایک اچھا افسانہ نگار بنایا ہے۔ آغا گل اگر افسانہ نگار نہ ہوتے تو مورخ ہوتے! اور مورخ بھی ڈاکٹر مبارک علی کے پائے اور مزاج کے۔

فکشن میں تخیل اور تخلیقیت کے ساتھ ساتھ دل چسپی بھی لازمی عنصر ہوتی ہے، جب کہ تاریخ میں حقیقی واقعات اور ماضی کی بازیافت بھی ہوتی ہے۔ کوئی بھی تاریخ کبھی مستند اور مکمل اس لیے نہیں ہو سکتی کی اس میں نسلی امتیازات، قومی مفادات، مذہبی تعصبات، ذاتی پسند ناپسند اور سرکاری دباؤ بھی کارفرما ہوتا ہے۔ آغا گل نے بلوچستان کی صحیح تاریخ کو فکشن کا جامہ پہنایا ہے۔ ان کا فکشن اور تاریخ ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہو گئے ہیں کہ دونوں میں تفاوت کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ تاریخ، تخیل اور تخلیقیت کے حسین امتزاج سے آغا گل کے فن نے جنم لیا ہے۔

مجموعی طور پر انھوں نے فکشن میں اخلاقیات کا دامن کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے اور ان کے افسانوں میں Innovative Style, Dual plot and Complex Themes کی وجہ سے متاثر کرنے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔ کرسٹوفر مارلو اور ملٹن کی طرح وہ افسانوں کی بنیاد اور مرکزی خیال Theology پر رکھتا ہے جس کی وجہ سے اکثر اوقات اس کے افسانوں میں Complex emotional ideas اور بغاوت کے عناصر موجود رہتے ہیں۔ حقل دما، قبرستان کی موت، ہابیل قابیل، پہلویا، تیتاغرمات، مسیت ناپاٹ، دل دریا اور دوسری بابری مسجد کا مطالعہ اس ضمن میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ البتہ ان کے افسانوں میں Atheism قطعاً داخل نہیں ہو سکا ہے۔

آغا گل کے افسانوں کا فنی پہلو

آغا گل لسانی تطہیر کے خلاف ہیں۔ ان کی تحریروں میں پشتو، بلوچی، پنجابی اور براہوی زبان کے الفاظ بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ براہوی کلچر اور بلوچستان کی سرزمین سے محبت ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ وہ اپنے افسانوں اور ان کے کرداروں کے لیے فرضی اسما کے بجائے اصلی نام کا انتخاب کرتے ہیں۔ نام رکھنے کے حوالے سے وہ بلوچستان کے لسانی اور تہذیبی مزاج کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ انھوں نے براہوی خیالات اور بلوچستانی افکار سے اردو افسانوی ادب کے دامن میں وسعت پیدا کی ہے۔ ان کے افسانوں میں بلوچستان کے شہروں، وادیوں، علاقوں، فصلوں، ریلوے اسٹیشنوں، دکانوں اور دیگر مقامات کے مقامی اسما اور وجہ تسمیہ کا بھی تفصیلی ذکر پایا جاتا ہے۔ اس کتاب کے آخر میں ان کے افسانوں میں استعمال کیے گئے پشتو، بلوچی اور براہوی زبان کے الفاظ کے حوالے سے 'فرہنگ' کے نام سے ایک پورا باب شامل ہے، جو آغا گل کے افسانوں کی تفہیم میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے افسانوں میں اردو اشعار، انگریزی اشعار، عربی اقوال، بائبل کے حوالے اور انگریزی الفاظ کا استعمال بھی وافر مقدار میں کیا ہے۔ وہ چوں کہ ایک تعلیم یافتہ لکھاری ہیں، ان کے استعمال کیے گئے انگریزی الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو ادب کے سوا سائنس، جغرافیہ، اسلامیات، ریاضی، قانون، تاریخ، انگریزی ادب اور فلمی دنیا کے متعلق بھی کافی معلومات رکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں سے صاف اندازہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ تقابل ادیان میں بھی بے انتہا دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہاں ان کے افسانوں میں شامل چند انگریزی الفاظ پیش کیے جاتے ہیں:

Claim, Sadist, Long Duel, Native, Rural, Urban, Endemic, Calm, Symbol, Origin, Survival, Highly skilled labor, Orator, Blind Fold, Constitutional Petition, Revenue, Catch Siding, As a legal right, Axial Belt, Trade Routes, Zhob Mother, Posthumous, Continental Shelves, Commercialization, War Industry, Fracture,

Mission Accomplished, Hercules in Chains, Dehydration, Blitz, Parasite, Unconvict, Bread Winner, Martial races, Pollution, Taste Develop, Cut-throat Competition, Death knell, Matriarchal and Patriarchal society, Nomadic Tribes, Domesticated, Polygamy, Polyandry, Misogynist, Missing Persons, Addiction, Sanctuary, Ghost Employees, Premature, Robots, No Grazing, De jure, De facto, Nostalgia, Metabolism, Anabolism, Catabolism, Big Bang, Logistic Support, Mercenary, El Nino, La Nina, Seal, Students Wing, Brave deserves beauty, Man behind the gun matters, They die young who speak truth, Power respects power, etc.

بلوچستان میں سیاسی پارٹیوں، طلبہ تنظیموں اور سیاسی تحریکوں کی مفصل تاریخ بھی ان کے افسانوں میں ملتی ہے۔ وہ درست سنہ، تاریخ اور دن کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ انگریز آفیسروں، سرداروں اور مقامی کرداروں کو اکثر ان کے اصلی اسماسے پکارتے ہیں، یعنی تاریخی حوالوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ فرضی نام استعمال نہیں کرتے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہو:

"پادری تھامس والپی فرنچ (1825-1895) جو لاہور ڈیو اسس کا پہلا بشپ بنا، افغانستان جاتے ہوئے انہیں سیوی میں ملا تھا۔"

1878 "میں امیر افغانستان نے کسی برطانوی مشن کے استقبال کی منظوری ٹھکرا دی۔" دوسری بابری مسجد

1897 "میں برطانوی سٹاف کو کابل میں قتل کر دیا گیا۔" دوسری بابری مسجد

"پادری ولیم کیری جس نے 1811 عیسوی میں بائیبل کا پہلا بلوچی ترجمہ شائع کیا۔" کھلی والا

"اور جب 28 مئی 1998 کو راسکوہ میں ایک ہیبت ناک دھماکہ ہوا اور پہاڑ سفید ہو گئے، اور زمین لرز اٹھی، اور Zhob Mother اوندھے منہ جا گری۔۔۔" آکاش ساگر

"ستمبر 1979 میں کمیونسٹوں کی جنگ کا آغاز ہوا تو اچانک رقابتیں، کدورتیں، نفرتیں اور دشمنیاں پھوٹ پڑیں۔ آگ کی فصل روبل اور ڈالر کی بارش میں پنپنے لگی۔" مٹی بکتی ہے

"ایسا نہ ہو کہ 1935 والا زلزلہ دوبارہ بجھوا دیا جائے، جو حسب معمول صبح تین بج کر تین منٹ پر انہیں آلے۔" سر کٹ

1972 "میں بلوچستان کو صوبے کا درجہ دیا گیا۔ قبل ازیں بلوچستان کہنا اس علاقے کو قابل دست اندازی پولیس ہوا کرتا تھا۔" استاد مہر

"ہندو مسلم فسادات کی ابتدا یوں تو 1920 سے کرا دی گئی تھی۔" معمورہ فرنگی

"تم جانتی ہو جناح بابا کی گیارہ اگست 1947 والی تقریر کے حصے کاٹ دیے گئے تھے۔ اسے نشر نہیں ہونے دیا گیا تھا۔ جناح نے نچلی ذات کے ہندو جوگندر ناتھ مینڈل کو وزیر قانون بنایا تھا جس نے احتجاجاً استعفی دیا تھا۔ جناح کو کافر اعظم کہنے والے یہاں دوڑے چلے آئے، حکومت پر قبضہ کر لیا اور لیاقت علی کو شہید کر دیا۔" مسیت ناپاٹ

"14 اگست 1955 کو جب ایسٹ بنگال کا نام مشرقی پاکستان رکھا گیا تو نواب نے بھی بیانات جاری کیے تھے۔" مسیت ناپاٹ

1955 "میں جب ون یونٹ بنا تو بلوچستان کا نام کوئٹہ قلات ڈویژن تجویز ہوا۔" عظیم ناول

"چارلس نیپیئر نے اعلان کیا تھا کہ جو کوئی بلوچی ٹوپی لائے گا۔ اسے دس روپیہ انعام دیا جائے گا۔" جادوئی ٹوپی

"انگریزوں نے 1885 میں کانگریس بناڈالی اور 1906 میں ان کی آشیرباد سے نواب سلیم اللہ نے ڈھاکہ میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔" بخال ہندویش بخشم

"بلوچستان 13 نومبر 1839 سے کالونائیز کر دیا گیا تھا۔ بلوچستان میں شعوری بیداری کی تحریک 1920 سے شروع ہوئی تھی" مستونگ میں مشاقیت

"جنوری 1966 کو تاشقند میں روس نے پاکستان بھارت معاہدہ کرایا کہ آئندہ نہیں لڑیں گے۔" تھیلے میں کشمیر

"بلوچ تو انگریز کے ہاتھ 107 برس، چار ماہ اور پانچ دن رہا۔" تھیلے میں کشمیر "اب حالت دیکھو۔ کوئٹہ میں بجلی 1891 میں آئی، وہ بھی صرف سٹاف کالج کے لیے اور شہر کو یہ بجلی 1929 میں ملی۔" بدروچ

ان کے افسانے ان کی آپ بیتی ہیں۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی کو بلوچستان بیتی بنایا ہے۔ ان کے افسانوں میں مقامی الفاظ اور مقامی تاریخ اتنی شد و مد سے تحلیل ہو گئی ہے کہ اکثر افسانوں کے آخر میں صرف یہ لکھنا بھول جاتے ہیں کہ "یہ ایک سچی کہانی ہے"۔ شاید نقاد اسی بنیاد پر آغا گل کے افسانوں کو بہترین افسانوں کی فہرست میں شامل کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ وہ سچ لکھتے ہیں۔ سچ لکھنے کے لیے جس قدر حوصلہ درکار ہوتا ہے اس سے کئی گنا زیادہ ظرف اس کو پڑھنے اور ہضم کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ آغا گل کے فکر و فن سے نقادوں کا اختلاف ممکن ہے، مگر یہ امر طے ہے کہ ہر تخلیق کار انتقاد کا پیمانہ اپنے ساتھ خود لاتا ہے۔ ایک تخلیق کار کو دوسرے تخلیق کار کے انتقادی پیمانے سے ماپنا شاید ادبی جہل ہو۔ فی زمانہ بلوچستان میں ہم اسی ادبی جہل کے دور سے گزر رہے ہیں۔ اسی ادبی جہل کی عکاسی انھوں نے اپنے افسانے 'عظیم ناول' میں بہت دل چسپ انداز سے کی ہے۔ جس میں ڈاکٹر کمال چاوسر کو مذاقاً بلوچستان کا بلند پایہ ادیب، محقق، دانش ور اور ماہر تعلیم پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو بلوچستان سے اس قدر لگاؤ تھا کہ موصوف نے بہت کم عرصے میں بلوچستان کی خدمت کے لیے نہ صرف اپنے گاؤں کے تمام نوجوانوں کو روزگار دیا، بل کہ بلوچستان کے ہر شعبہ زندگی پر کتابیں در کتابیں بھی تصنیف کیں۔

"اس کی ہر کتاب بلوچستان کے نام سے ہوتی۔ بلوچستان میں گدھوں کی دولتیاں، بلوچستان میں اونٹوں کے شتر غمزے، بلوچستان میں سیاست دانوں کی خرمستیاں، بلوچستان میں کفر کی بدبو، بلوچستان میں ایمان کی مہک۔۔۔اس کی آخری کتاب کا نام ہو گا، بلوچستان میں ہیضہ "!

اس افسانے کے مرکزی کردار کو اگر سرعام ڈی کوڈ کیا جائے، تو اس سے عارضی طور پر ادبی بد ذوقی پیدا ہو سکتی ہے۔ بلوچستان کے ادبی سرخیلوں کی فہرست میں سے آغا گل کے انخلا کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انھوں نے ماضی کو شکست و ریخت اور تاریخ کو ڈی کنسٹرکٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ ویسے بھی ان کی حقیقت نگاری کی وجہ سے ان پر پہلے ہی سے سیاسی، سماجی اور مذہبی دائرے تنگ ہو گئے ہیں۔ اس حقیقت کی تصدیق وہ خود یوں کرتے ہیں:

"آغا گل گم نامی میں کیوں نہ رہے؟ ملالہ یوسف زئی کو امریکی سی آئی اے نے آسمان پہ بٹھایا۔ اقبال ملکہ کا وفادار Knight بنا۔ غالب نے ملکہ وکٹوریہ کے قصیدے لکھے، اور خود کو آدھا مسلمان قرار دیا۔ تقسیم بنگال پر مسلم مفادات کے خلاف انگریز غلامی کی سپورٹ سے سید احمد نے Sir کا خطاب پایا۔ امریت کی مدد کر کے ادیبوں کے منہ میں لگام دے کر قدرت اللہ شہاب اعلی آفیسر اور ولی اللہ قرار پایا۔ لیکن آغا گل تھڑوں پر براجمان، ریڈ زون جو ذہنی ریڈ لائیٹ ہے، سے کہیں دور سبالٹرن فکشن لکھے جاتا۔"

آغا گل نے نہ صرف افسانے کے فن کو اپنے مزاج کا تابع بنایا ہے، بل کہ اپنی زندگی کو بھی اپنے وضع کردہ سیاسی، مذہبی، سماجی اور معاشی اصولوں کے مطابق ڈھالا ہے۔ تاہم ان کے بعض ادبی نظریات سے اختلاف کی گنجائش ہے۔

آغا گل نے کبھی بھی فکر کو فن پر قربان نہیں کیا، البتہ انھوں نے اکثر مقامات پر فن کو فکر پر قربان کر دیا ہے۔ بے تکلف آغاز، سنجیدہ عروج، نشتریہ کمال اور مزاحیہ انجام ان کے افسانوں کی پہچان ہے۔ ان کے افسانوں کا اختتام پر امید تبدیلی پر نہیں، بل کہ مایوس کن اسٹیٹس کو کی تا حیات بحالی پر ہوتا ہے۔ کہانی کو عروج کے بعد انجام دینا آسان ہے، مگر عروج کے بعد کمال تک پہنچانا کوئی آغا گل سے سیکھے۔ عموماً افسانوی ادب میں افسانے کے لیے کہانی کا اہتمام کیا جاتا ہے، مگر وہ کہانی کے لیے

افسانے کا اہتمام کرتے ہیں۔ وہ فرضی کہانی کو افسانوی رنگ نہیں دیتے، بل کہ حقیقی کہانی کا رنگ اڑا کر ڈھانچے کو بے لباس چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ خود کہانیوں کا تعاقب نہیں کرتے، بل کہ کہانیاں ان کا تعاقب کرتی ہیں۔ ان کی کہانیاں تخیل و تفکر کی پیداوار نہیں، بل کہ ان کی عملی زندگی کا ثمر ہیں اور انھوں نے اظہار کے بجائے معنی کو فوقیت دی ہے۔ ان کے ہاں اظہار اور معنی میں توازن مفقود ہے۔ ان کا فن چوں کہ تخیل سے زیادہ تجربے اور الہام سے زیادہ اکتساب کی پیداوار ہے، اس لیے ان کے فن میں تقلیدی صورت کے بجائے تسخیری صورت، روایتی ادبی اسلوب کے بجائے ذاتی ادبی اسلوب اور لغوی ذخیرے کے بجائے عوامی لسانی ذخیرہ پایا جاتا ہے۔ ان کے پلاٹوں کی ساخت نزول سے صعود کی طرف نہیں، بل کہ صعود سے نزول کی طرف ہے۔ وہ خط مستقیم میں سفر نہیں کرتے، بل کہ درمیان میں بیٹھے ترازو کے دونوں پاٹوں کا وزن برابر کرتے کرتے آخر توقع کے خلاف فیصلہ سنا دیتے ہیں۔ انھوں نے فنی لحاظ سے مغربی اور اردو کلاسیکی افسانوی ادب کی ٹیکنیک، ماہیت، پلاٹ اور دیگر لوازمات کی خاص نقل بھی نہیں کی ہے۔ وہ اکثر افسانوں کی آخری سطر میں مزاح اور ظرافت کا طوفان برپا کر دیتے ہیں۔ اس مزاح میں نشتریت بھی ہے اور افسانے کا انجام بھی۔ اگر افسانے میں سے آخری چند سطور کو منہا کیا جائے تو صرف ایک تاریخی حقائق رہ جاتے ہیں۔ یہاں چند مثالیں دی جاتی ہیں۔

جادوئی ٹوپی نے افسانہ نگار کی ناک میں دم کیوں کر رکھا تھا، زرا یہ وجہ ملاحظہ ہو:

"جادوئی ٹوپی پہننے والا تو دکھائی ہی نہیں دیتا، جبکہ یہ ٹوپی پہننے والا نہ صرف یہ کہ دکھائی دیتا ہے، بلکہ ستم یہ کہ دشمن ہی دکھائی دیتا ہے۔"

یہاں آپ جادوئی ٹوپی کو بلاچوں وچرا بلوچی ٹوپی کہہ سکتے ہیں۔ یعنی اب حالات یہاں تک آ پہنچے ہیں کہ بلوچی لباس پہننے سے یا گفٹ میں قبول کرنے سے پہلے کئی دفعہ سوچنا پڑتا ہے۔ میرے خیال میں یہ بدسلوکی اب پشتون اور براہوی کلچر تک بھی سرایت کر چکی ہے۔ حالاں کہ یہ تینوں قومیں اس سرزمین کے مالک اور امین ہیں۔ اپنی تہذیب و ثقافت کی وجہ سے اپنی

سر زمین پر اجنبی، مشکوک اور بے وقعت ہونا بہت اذیت ناک تجربہ ہوتا ہے۔ یہاں کے باسیوں کے لیے اب یہ تجربہ نہیں عادت بن گئی ہے۔

مزاحیہ انداز سے آخری سطروں میں کہانی کو افسانے میں یوں تبدیل کرتے ہیں:

"استاد! میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حکم کیجیے۔"

لجاجت سے بولے۔ "کسی کو نہ بتانا کہ تم میرے شاگرد ہو۔ عمر بھر یہ احسان نہ بھولوں گا۔" رموز بیان

فدوا کی محبت ناکام کیوں ہوئی؟ آیئے دیکھتے ہیں کہیں ایسا واقعہ ہمارے ساتھ بھی نہ ہوا ہو۔

فدوا نے ایک روز سوال کیا۔

"اگر میں حلیم کی دکان کھولوں تو کیا تم مجھ سے شادی کر لو گی؟"

وہ مکارہ دشمن جان طوطا چشم نکلی۔ جھپکی دے کے معصومیت سے بولی:

"نہیں میری تو منگنی ہو چکی ہے، میں اپنا پتا دے جاؤں گی۔ تم وہاں ریڑھی لے کر آنا۔" فدوا

'پرتھوی، غوری' ایک تلخ حقیقت پر مبنی افسانہ ہے۔ اس افسانے پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ اس میں ان حقائق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن سے کوئی مفر نہیں۔ مذاہب اور سیاست کی آڑ میں انسان انسان کو مارنے کے درپے ہے۔ انسانوں نے ہوائی جہاز، گائیڈڈ میزائلیں، تباہ کن بم اور مہلک ہتھیار بنائے، مگر نیچر کی معمولی معمولی سختیوں، موسمی تبدیلیوں، گلوبل وارمنگ، وباؤں اور دیگر قدرتی آفات سے نمٹنے میں ناکام رہے۔ یہ کامیابی تب ممکن ہے جب حکمرانوں کی سوچیں اور ترجیحات بدل جائیں۔

"بھیڑیوں کی خون آلود کھالوں کے نیچے خود میں ڈوبے ہوئے آپس میں لپٹے ہوئے دو انسان پڑے تھے، یخ بستہ۔ آپس میں لپٹے ہوئے، جنہیں کاٹے بن الگ کرنا ناممکن تھا۔ مگر ان دونوں کا الگ الگ کیا جانا ضروری تھا، کیونکہ ایک کو دفنانا تھا، دوسرے کو جلانا تھا۔ پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ!!" پرتھوی، غوری

ان کے افسانوں میں کہانی کے ساتھ ساتھ ابلاغ بھی ہے۔ ان کے افسانوں میں عورت ایک شرمیلی اور کمزور جنس نہیں، بل کہ تیغ و تفنگ سے واقف اور سرمچاروں کے شانہ بشانہ لڑنے والی ہیروئین بھی ہے۔ آغا گل اپنے افسانوں میں عینی شاہد اور میر کاروان کا کردار ادا کرتے ہیں۔ مقامی اور ثقافتی کہانیوں کو یوں ادبی انجام دیتے ہیں کہ خود بیتی سے بلوچستان بیتی بنا دیتے ہیں۔ ان کے ناولٹ نما افسانے یا تلخیص شدہ ناول اپنے اندر بلوچستان کی قدیم تاریخ سے اب تک کی مذہبی، سیاسی اور سماجی تاریخ کو سموئے ہوئے ہیں۔ وہ کرشن چندر کی طرح رومان سے حقیقت کی طرف سفر کرتے ہیں۔ ان کے فن میں دھول اڑاتی بسیں، کھٹ کھٹ کرتی ریل کی آوازیں، سپاہیوں کی بندوقوں سے گولیوں کی بوچھاڑ، تھانیداروں کی زناٹے دار تھپڑوں کی بارش، سڑکوں پر دھرنا دیے اور سراپا احتجاج کرتے عوام، سرکار اور عوام کی آپس میں ہاتھاپائی، گرتی لاشوں کے مناظر، ڈاک خانوں کا دل چسپ اندرونی ماحول، درباروں اور مزاروں پر ضعیف الاعتقاد لوگوں کا رش، سرداروں کے آگے غریب مظلوم عوام کی دست بستہ قطاریں، جیلوں کے اندر قیدیوں کی قابل رحم صورت حال، سرداروں اور تھانیداروں کی ملی بھگت، محبتوں کی بیخ کنی اور نفرتوں کی پرورش کی چلتی پھرتی عکاسی کی گئی ہے۔ ان کی تحریروں کو بلوچستان کا تہذیبی مطالعہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ آکاش ساگر میں روئے زمین پر بلوچستان کا معرض وجود میں آنا یوں بیان کرتے ہیں:

"دس ارب سال گزرے اور ایک مہیب زلزلہ آیا اور پھر پانیوں کے نیچے بہت نیچے جہاں سرکتے ہوئے Discs ہیں جو براعظموں کو لیے پھرتے ہیں۔ ایک خوفناک دھماکہ ہوا Continental Shelves ہل گئے۔ زمین سمندروں سے باہر نکل آئی اور Axial Belt بلند ہوئی اور کوہ ہمالیہ بن گیا اور سمندر کی اتھاہ گہرائیوں سے بالکل پاتال سے بلوچستان باہر آگیا۔"

ان کے افسانوں میں ریل گاڑی کا کردار معنی خیز ہے۔ ریل گاڑی نے بلوچستان میں کیا کیا تبدیلیاں لائیں، یہ ایک الگ بحث ہے، مگر ریل کے آنے سے بلوچستان میں مزاحمت، بندوق اور سیاست بھی آئی۔ آغا گل کے پاس ریل، اس کے ماحول، انجن، پٹڑیوں، اور اسٹیشنوں کے متعلق کافی معلومات ہیں۔

"آبِ گم سے کوئٹہ جانے والی ریل گاڑی کو ایک اضافی انجن لگتا، جسے نبو چلا کرتا۔ مچھ سے کولپور تک کی چڑھائی ایک تینتیس کے تناسب سے ہے۔ نیل گری (انڈیا) اور سوئٹزرلینڈ میں بھی ریلوے لائن کی اٹھان کا تناسب اس سے کہیں کم ہے، لہٰذا نبو بجا طور پر فخر کرتا کہ وہ ایسے ٹریک پر جس کے ایک ٹکڑے کے نیچے لکڑی کے تیرہ سلیپر ضروری تھے، بریک کا ویکیوم 16 انچ رکھنا پڑتا۔ بوائلر میں اسٹیم پریشر ایک سو باون سے ایک سو اسی تک ہونا ضروری تھا۔ انڈیا میں بہت سے ریلوے انجن چل رہے تھے، ایکس اے انجن میدانوں کا گھوڑا تھا۔ سبی سے آگے سندھ کی جانب یوں دوڑتا کہ جی خوش ہو جاتا مگر بولان میں منہ کی کھاتا۔" حلی

ادب میں علامت کا ظہور کلام میں حسن پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ حاکمِ وقت کے غیض و غضب سے جان کی امان پانے کے معنوں میں بھی ہوا ہے۔ آغا گل نے اپنے افسانوں میں علامت کا استعمال مذکورہ بالا دونوں مقاصد کے برعکس یعنی خلقت شہر کو جگانے، آگ کو ہوا دینے، بات کو جنگل میں آگ کی طرح پھیلانے اور اسٹیٹس کو کو سرِ عام چیلنج کرنے کے معنوں میں کیا ہے۔ ان کے ہاں علامتیں باقاعدہ شخصی ہو گئی ہیں۔ پوغٹ، پوو، سرکک، بوانٹو، ملنگ بابا، فدوا، کمال چوسر، جنات، کسبی، کماش، گنوک، ڈریکولا اور مجاہدِ اعظم ان چند علامتی کرداروں میں سے ہیں جن میں منجمد ذہنوں کو ہلانے کی بھرپور قوت ہوتی ہے۔ آغا گل عموماً شعور کی رو، بیانیہ انداز اور واحد متکلم کے صیغے میں افسانہ لکھتے ہیں۔ اس واحد متکلم کے صیغے کی کثرتِ استعمال سے ان کے ہاں نرگسیت، وجودیت، انفرادیت، تجربیت اور استفہامیت بھی پائی جاتی ہے، جو جدیدیت کے اہم ستون ہیں۔ جدیدیت دراصل ترقی پسند افسانے کے ردِ عمل میں وجود میں آئی، جس میں تجریدیت کو بھی بہت شہرت ملی، مگر آغا گل نے تجریدیت کے بجائے تجسیم میں محدود پیمانے پر تجربات کیے۔ جدیدیت دراصل منجمد مذہبی، سماجی، سیاسی اور ادبی روایات سے بغاوت بھی ہے جس کے نتیجے میں مزاحمت کے ساتھ ساتھ ذاتی کرب، سوشل آئیسولیشن، ذہنی تناؤ اور بے

چینی بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس صورت حال سے کامیابی کے ساتھ نمٹنے کے بعد وجود میں آنے والا انسان 'وجودی' ہوتا ہے جس میں خودی، اعتماد اور حالات سے لڑنے کی قوت آجاتی ہے اور اس کے ثمرات دور رس ہوتے ہیں۔ آغا گل کی فکر و فن میں جدّت کے بطن سے جنم لینے والی وجودیت اپنے جوبن پر ہے۔ وجودی انسان ہمیشہ 'مخالف زمانے' میں جنم لیتا ہے، مگر اپنی باقی زندگی کو اپنے بنائے ہوئے ضابطوں کے تحت گزار لیتا ہے۔ کٹھن اور پر خار سفر کا آغاز ہمیشہ ایک وجودی فرد سے ہوتا ہے، جو بعد میں آہستہ آہستہ کاروان بنتا چلا جاتا ہے۔

"غالب اور اقبال کی طرح تخلیق کاروں کوFavourableTime کہاں ملتا ہے۔ میں نے بھی مخالف زمانے میں جنم لیا۔ مجھے پچاس برس بعد پڑھا جائے گا۔ نصابوں میں شامل کیا جائے گا۔ میں دو قومی نظریے کے جبر کا فکشن رائٹر ہوں۔ جہاں ارشد شریف جیسوں کے اکھڑے ہوئے ناخن اور ٹوٹی ہوئی انگلیاں لکھاری کی راہ روکتی ہیں۔ میں اپنے عہد کا پطرا (اکیلی چٹان) ہوں، جس پر ادبی کلیسا تعمیر ہوگی۔

آج میری کتابیں ردّی والے ٹھیلوں پہ لیے پھرتے ہیں۔ جب کہ جوتے ائیر کنڈیشنڈ دکانوں میں فروخت ہوتے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کی قوم نے بچھڑے کی عبادت شروع کر دی تھی۔ ایک فی صد اشرافیہ کے پاپ کے سانپ نے ننانوے فی صد قوم کو بچھڑے کے چمڑے سے بننے والے بوٹ کا پجاری بنا رکھا ہے۔

میں آنے والی نسلوں کے لیے لکھے جاتا ہوں۔ جن میں شرک نہیں ہوگا۔ خدا اور شیطان کو ایک ساتھ رکھنے کی کوشش نہیں ہوگی، وہ خالص ادیب اور ادب نواز ہوں گے۔" 'رانی' افسانوی مجموعے کا پیش لفظ

آغا گل کے افسانوں میں کردار نگاری

افسانوی ادب میں کردار کا کام کہانی کو بیان کرنا، آگے لے جانا، کہانی میں تبدیلی لانا اور اور کہانی کو انجام تک پہنچانا ہے۔ یہ کردار انسان، حیوان، چرند، پرند، رنگ، آہنگ، صوت اور علامت بھی ہو سکتا ہے۔ عموماً اظہار رائے پر پابندی کے دوران میں علامتی کرداروں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اور بعض اوقات یہ طریقہ کار کسی ادیب کے اسلوب کا خاصہ بھی ہو سکتا ہے۔ افسانوی ادب میں کردار نگاری بہت توجہ طلب ہوتی ہے۔ جن کرداروں کے ذریعے کہانی کو بیان کیا جاتا ہے، ان کرداروں کی نفسیات، زبان، تہذیبی پس منظر، روایات اور استعمال سے واقف ہونا از حد لازمی ہے۔ افسانوی ادب میں داستان کے کرداروں میں جن، پری، دیو، شہزادی، شہزادہ اور بادشاہ جیسے کرداروں سے کام لیا جاتا ہے۔ ڈراما نگاری میں اشرافیہ، محلات، سازشوں اور دیگر سرمایہ دار طبقے سے تعلق رکھنے والے کرداروں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ ناول کے کردار مڈل کلاس یا عام عوام ہوتے ہیں۔ کرداروں کے انتخاب کے حوالے سے ناول جمہوری اور عوامی ہوتا ہے۔ اور افسانہ نگاری میں کرداروں کا انتخاب اشرافیہ، اپر مڈل کلاس، مڈل کلاس اور لور مڈل کلاس سے کیا جاتا ہے۔ کرداروں کے انتخاب کے حوالے سے افسانہ انکلوسیو ہوتا ہے۔

آغا گل کے افسانوں کے کرداروں کا تعلق مڈل اور لور مڈل کلاس سے ہے۔ چوں کہ ان کا موضوع بلوچستان ہے، بلوچستان سیاسی، سماجی اور معاشی لحاظ سے ایک پس ماندہ صوبہ ہے اور اس کے عوام بھی زندگی کی بنیادی سہولتوں (امن، تعلیم، روزگار، صحت، وغیرہ) سے محروم ہیں۔ بلوچستان جیسے پس ماندہ صوبے میں آسودہ حال صرف اشرافیہ، سیاست دان، حکمران اور مقتدر طبقہ ہی ہو سکتا ہے، جو ان کا موضوع نہیں۔ ان کے کرداروں میں بیمار کسان، بدحال موچی، لاچار مزدور، غریب چرواہا، بے کس ڈرائیور، ان پڑھ میکنک، عقل مند بوڑھا، رحم دل بڑھیا، بہادر کنواری لڑکی، مزاحمت سے چھلکتا ہوا نوجوان مرد، جدید تعلیم سے آراستہ طالب علم، کام چور استاد، نکما اردلی، عیار دشمن، سازشی دوست، صلح جو معمر افراد، کاہل سرکاری ملازم، رشوت خور آفیسر، موقع پرست نواب، برداشت سے عاری سپاہی، مکار سردار اور استحصالی سرکار شامل ہیں۔ ڈاکٹر

کمال چوسر، باھوٹ، بابو، شودر، فدوا، ڈریکولا، ہاتھی، غیرتی، شربت خان، شیلا کمہاری، مجاہد اعظم، بوانٹو، پرتھوی، غوری، گنوک، پوغٹ، خان مستانہ، پوو، بندغ، کسبی، سرکک، عوضی، معمورہ فرنگی، بھولو، نبو، زباد، مرزاجور، بابو، رخسانہ، نجیب، نواب مری، غازی نورامینگل، رحمان، بیلہ اور بالاچ ان کے پسندیدہ کرداروں میں سے ہیں۔

ان کے کردار پرامن، مگر اپنے جائز حقوق کے حصول کے لیے کسی بھی حد تک جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے ان کے کرداروں کا پس منظر، معاشی حالت اور جغرافیائی محل وقوع ان کو کامیابی حاصل کرنے سے بار بار باز رکھتے ہیں اور انھیں کماحقہ کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ اس عارضی ناکامی اور جانی ومالی نقصان اٹھانے کے باوجود ان کے کرداروں میں دوبارہ ابھرنے کی قوت موجود رہتی ہے۔ ان کے کرداروں میں انتہائی درجے کی مزاحمت پائی جاتی ہے اور وہ ہر اس سرکاری بیانیے کی قلعی کھول دیتے ہیں جو ان کی نظر میں حقیقت کے خلاف ہے۔ وہ بلوچستان کو صرف کوئٹہ شہر کے بڑے بڑے محلات، شان دار ہوٹلوں، مہنگے شاپنگ سنٹرز، عالی شان سرکاری دفاتر، چمکتی گاڑیوں، پکی سڑکوں، کاروباری مراکز، سائنسی تعلیمی اداروں اور جدید اسپتالوں تک محدود کرنا نہیں چاہتے، بل کہ ان کے کرداروں کے نزدیک امن، بجلی، گیس، تعلیم، صحت، پانی، روزگار، روٹی، کپڑا، مکان اور دیگر سہولتوں سے محروم قلات، خضدار، مکران، جھل مگسی، چمن، ہرنائی، مستونگ، ژوب، لورالائی اور دور افتادہ دیہی علاقے بھی بلوچستان کا حصہ ہیں۔ آغا گل کے کرداروں نے بلوچستان کو بھوک اور پیاس سے نڈھال، عدل و انصاف کو ترستا ہوا، خواتین کے لیے ظالم اور حکمرانوں سے نالاں پیش کیا ہے۔

آغا گل کی مکالمہ نگاری اور منظر نگاری

افسانوی ادب دراصل مکالمہ نگاری، منظر نگاری، زبان و بیان، وحدت تاثر اور ڈرامائی انداز کے بغیر اپنا وجود قائم نہیں رہ سکتا۔ آغا گل کے افسانوں کا آغاز بیانیہ طرز پر ہوتا ہے، اور ڈرامائی مکالموں کے زریعے انجام پیش کرتا ہے۔ وہ معمر افراد، کم سن بچوں، کنواری لڑکیوں، سرمچاروں اور سرکار کی زبان خوب جانتے ہیں۔ افسانہ لکھتے ہوئے منظر نگاری کے فن کا پورا اہتمام کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے گویا انسان یہ سارا منظر خود دیکھ رہا ہے، خواہ یہ منظر جیل کا ہو، جنگ کے میدان کا ہو، عدالت میں پیشی کا ہو، مصیبت یا خوشی کا ہو یا زیادہ سے زیادہ ظلم و بربریت کا ہو۔ آغا گل کی منظر نگاری اور مکالمہ نگاری ملاحظہ ہو:

خوش مزاج خیر جان مالی سے اس کی اداسی اور سرد مہری کے متعلق مکالمہ ملاحظہ ہو:

کیا ہوا خیر جان؟ بولتے کیوں نہیں؟

گہری کاریز سے خیر جان کی کانپتی ہوئی آواز نکلی، جیسے گہرے کنویں سے چھلکتا کانپتا ڈول نکلتا ہے۔

"ستار کو لے گئے، ستار کو اٹھا کر لے گئے۔"

مجھے جھٹکا سا لگا۔ جیسے کسی نے سرد پانی کا ڈول مجھ پہ انڈیل دیا ہو۔

میں بوکھلا کر اٹھا اور خیر جان کے ساتھ آ بیٹھا۔

"کون لے گیا ستار کو؟"

اچانک ہی شام غریباں اتر آئی تھی۔

خیر جان نے طاقت جمع کی۔ "سرکار لے گئی، پوچھ گچھ کے لیے۔"

میرا من کانپ اٹھا۔

میرے سامنے صحراؤں کی مسخ شدہ لاشیں گزر گئیں۔۔۔اور تو تک کا اجتماعی قبرستان جو ساڑھے تین سو انسانوں کو اپنی کوکھ میں لیے بیٹھے تھا، سبھی کو سموچا نگل گئی۔ حقل دما

برسوں بعد جب سیٹھ کی حویلی کے متعلق استفسار کیا جاتا ہے تو کچھ یوں مکالمہ ہوتا ہے:

"اب یہ حویلی کس کی ہے؟"

انھوں نے مشترکہ قہقہہ لگایا۔ ایک بزرگ نے مسکرایا۔

"آپ آفیسر ہو کر بھی نہیں جانتے کہ شوم کامال غازی کھاتا ہے۔" شوم کامال

جب سرکار کا کماش کے شوقین عوام کو معمولی سزا دینے سے دل نہ بھرا تو مذید سخت سزا کے حوالے سے یہ مکالمہ معنی خیز ہے:

"کہہ دوان سے کہ وہ کماش کے سامنے بیٹھنے والوں اور دیکھنے والوں کی آنکھیں ہی نکلوا ڈالیں، نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔"

دلاور نے بات کو تولا۔ پھر معنی خیز انداز میں میں تشویش کا اظہار کیا:

"مگر اتنی آنکھیں ہم کیا کریں گے؟"

دینار نے تسلی دی:"چار چار لگالینا۔ ان کا کھو کھا کھول لینا۔" کماش

بھولو کو جب مریوں کو واپس کرنے کا منصوبہ بنا، تو بابا نے یہ ذمہ داری داؤد کو سونپی:

"بھولو مریوں کو واپس دے آئے دادو؟"

دادو ندامت سے بولا:"جی نہیں"

بابا چونک اٹھے "کیا مطلب؟ میں نے جو تمھیں کہا تھا۔

دادو بھرائی ہوئی آواز میں بولا، "گلو شہر سے آگے دریائے ناڑی کے راستے پہ سپاہیوں نے زنجیر لگا رکھی تھی، انہوں نے مجھ سے چھین لیا۔"

بابا تڑپ اٹھے، "وہ کیوں؟"

دادو ہچکچاتے ہوئے بولا؛" کہہ رہے تھے ہم وطن کے محافظ ہیں، یہ ہمیں دے دو، ہم اس کی سجی بنائیں گے۔" بھولو

ایک دور اندیش شہری اور ایک محدود ذہن کے حامل دیہاتی کے درمیان کی گئی بات چیت محض ایک مکالمہ نہیں، بل کہ فلسفیانہ گفت گو بھی ہے:

"کیا تم چھتوں کے نیچے مکدر فضا میں زندگی گزارو گے؟

شہروں میں رہنا ضروری ہے، وہی قومیں تو حکمرانی کرتی ہیں، جن کا شہروں پر قبضہ ہو، خصوصاً دارالحکومت پر، یہ شہر ایک روز دیکھ لینا کہ دارالحکومت بنے گا۔

مگر تم باپ دادا کی روایت توڑ رہے ہو۔ قبیلے والے خفا ہوا کرتے ہیں۔

روایت اس پکے پھل کی مانند ہے، نہ توڑو تو خود ہی ٹپک کر گر جایا کرتی ہے، ہر شئے کی ایک طبعی زندگی ہے، روایت اسے مبرّا نہیں۔" کورہ کئی

آغا گل کے افسانوں میں طنز و مزاح کا امتزاج

کلام میں طنز و مزاح لفظ کی رنگین خلعت اور معنی کی مسحور کن خوشبو کے مترادف ہے۔ طنز و مزاح کے بغیر کلام پھیکا، بے لطف اور تھکا دینے والا ہوتا ہے۔ طنز سوئی چبھانے، رلانے، اذیت پہنچانے، خواب غفلت سے ایک دم جگانے، بداعتدالیوں کی طرف متوجہ کرنے، برائیوں سے فوراً احتراز کرنے اور ایمر جنسی بنیادوں پر عملی زندگی کو کارآمد بنانے کے لیے؛ جب کہ مزاح گدگدانے، ہنسانے، تفریح فراہم کرنے، دماغ کو فرحت بخشانے، دنیا کے دکھوں سے عارضی طور پر انجان ہونے اور زندگی کو نارمل انداز سے گزارنے کے لیے کیا جاتا ہے۔

آغا گل کے افسانوں اور ناولوں میں اعصاب شکن تاریخ کے ساتھ ساتھ روح کو تسکین دینے والی ظرافت اور انسان کو چونکا دینے والا طنز بھی بڑے پیمانے پر شامل ہے۔ ان کا مزاح لاشعوری اور طنز شعوری ہوتا ہے۔ مقامی زبانوں کے الفاظ، محاورے، اقوال، اشعار اور ضرب الامثال کے استعمال نے ان کے کلام میں طنز و مزاح کا حسن دوبالا کیا ہے۔ یہ طنز و مزاح صرف لفظوں کا کھیل نہیں ہے جو پڑھنے کے فوراً بعد ہوا میں تحلیل ہو جائے، مگر اس میں فلسفیانہ انداز کے انضمام کی وجہ سے ابدیت بھی پائی جاتی ہے۔ یہ انداز کسی کی نقل نہیں اور نہ ہی اکتساب ہے، بل کہ اس سرزمین پر رہنے کے بعد تجربے کی عطا ہے۔ یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

"بیوی کمزور شوہر کی دیوی، اور طاقتور کی کنیز ہوا کرتی ہے۔" تحفہ

"بلوچستان شہدا میں خود کفیل ہے۔" تحفہ

"کتابوں کی دکانیں ملک بھر میں جوتوں کی دکانوں میں تبدیل ہو رہی ہیں۔" چھ قاف

"چین نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو جائے نماز، تسبیحیں، ٹوپیاں دینے کا ٹھیکہ اٹھا رکھا ہے، مگر کم بخت خود صاحب ایمان نہ ہوا۔" چھ قاف

"جاہلوں پر حکومت کرنے کے لیے مذہب کا لبادہ اوڑھ لو۔" چھ قاف

"ہر امریکی ڈالر پر پرنٹ ہوتا ہے In God We Trust شاید یہ Misprint ہے۔ Satan لکھنا چاہیے تھا۔"

"پارسی انگریزوں کے پروردہ تھے۔ راج دربار میں براجنے لگے۔ یہ سب تو بلوچستان کے لوکل قرار پائے گئے اور ہم کلمہ گو نان لوکل!!" روپے کا جن

"آپ کو نہیں اس کرسی کو سلام کرنے چلا آیا ہوں۔ دو ٹانگوں والے انسان سے یہ چار ٹانگوں والی کرسی کس قدر طاقت ور ہے۔ بیٹھے اس کرسی سے نہ اٹھا کریں ورنہ آپ کا بوانٹو گر جائے گا۔" بوانٹو

"روایت ایک پکے ہوئے پھل کی مانند ہے، اسے نہ توڑو تو خود ہی گر جایا کرتی ہے۔"

"یہاں عوضی کا موسم تھا۔ ہر کوئی عوضی تھا۔ وزیر اعلی سے لے کر وزیر مشیر تک سبھی عوضی تھے۔" عوضی

"قیدیوں کی زندگی ستاون اسلامی ملکوں کے آزاد شہریوں سے مختلف نہ تھی۔ وہ موت اور زندگی کے درمیان جھولتے رہتے۔ کوئی سانسوں کی زنجیر توڑ ڈالتا تو اسے ویران قبرستان میں دفن کر آتے۔ جو قیدیوں، پردیسیوں کے لیے مخصوص تھا۔" چار گل

"بس کے انتظار میں پروفیسر اور لیکچرار قبرستان کے پہلو میں آن بیٹھتے۔ چلاتی دھوپ میں اکڑوں بیٹھنے کا یا گا کرتے ہوئے متعدد پروفیسر گنجے ہو چکے تھے۔ قبرستان کے ساتھ کالج اساتذہ کو یوں بیٹھے دیکھ کر گمان ہوتا کہ علم کی نمازِ جنازہ پڑھانے یا دفنانے آئے ہیں" شالوم

"لیکچراروں کی حیثیت دریائی گھوڑوں جیسی ہوتی ہے۔ نہ تو وہ پورے گھوڑے ہوتے ہیں اور نہ ہی مگرمچھ۔ وہ سرکک کی طرح اپنے ہی خول میں سر دیے علم میں ڈوبے رہتے ہیں۔ کالج سے گھر اور گھر سے کالج ہی ان کی زندگی ہوا کرتی ہے۔" مستونگ میں مشتاقیت

"کیونکہ مجھے بتلایا گیا تھا کہ اژدھے کی عمر ننانوے برس ہے۔ سو برس کا ہوا تو پھر اپنی شکل بدلنے پر بھی قادر ہو گا۔ کیا عجب کچھ مال پانی دے کر شناختی کارڈ بنوالے اور حسبِ معمول جعلی ووٹوں کے ذریعے ہمارا صدر ہی بن جائے۔" صنم تراشیدہ

"برقع پوش خاتون بھی بغیر نمبر پلیٹ کار کی طرح ہوتی ہے، کچھ اتہ پتہ نہیں چلتا۔" کباڑی بازار

"ویسے یہ شیکسپیئر یہی اپنے مستونگ کا تھا، نام شیخ پیر تھا۔ انگریزوں نے بگاڑ کر شیکسپیئر رکھ دیا۔" کباڑی بازار

"دانش ور محسوساتی دنیا میں پرائے اصول اپنا کر جیتے ہیں۔ نہ مکمل غیر مادی زندگی اور نہ مکمل مادی زندگی۔ جیسے علومِ نجوم کی برجِ قوس والی مخلوق، جس کا نصف دھڑے گھوڑے کا ہے، نصف انسان کا! نامکمل انسان، نامکمل گھوڑا یا پھر تھوڑا سا انسان، تھوڑا سا گھوڑا۔" اسپیڈ بریکر

"بچپن میں فرید کو ملازمہ کے ساتھ سلایا جاتا تھا، وہاں تل دھرنے کی جگہ نہ رہتی، اس قدر مہمانوں کا اژدھام رہا کرتا، نوجوان ملازمہ کے ساتھ ایک معصوم بچے کو سلانے میں قباحت نہ تھی، نہ ملازمہ کو اعتراض، کیوں کہ وہ تو اس کے باپ کو بھی ہینڈل کر چکی تھی۔" کورہ کئی

"بھوک فوجی حکومت کی طرح ان کے گھر پر مسلط ہو چکی تھی۔" بیلہ

"رونے سے کوئی مرتا تو ملک کی آبادی کب کی ختم ہو چکی ہوتی۔" ماجو

آغا گل کی مشکل پسندی

آغا گل ایک تعلیم یافتہ ادیب ہیں۔ ان کو بہ یک وقت اردو، انگریزی، ہندی، عربی، فارسی، پشتو، بلوچی، براہوی اور ہزارگی زبان پر قدرت حاصل ہے۔ ان کے افسانوں اور ناولوں میں قران، حدیث، انجیل، تورات، زبور اور بھگوت گیتا کے حوالے بھی وافر مقدار میں موجود ہیں۔ اسی طرح انھوں نے انگریزی، عربی اور فارسی ادب کے کئی حوالے بھی اپنی تحریروں میں دیے ہیں۔ جس طرح وہ خود ایک عالم و فاضل لکھاری ہیں، اسی طرح ان کا قاری بھی عالم و فاضل ہونا چاہیے۔ وہ عوام کے لیے نہیں لکھتے اور نہ ہی عام آدمی ان کا مخاطب ہے، ان کا مخاطب خواص ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ عوام کے مسائل سے سروکار رکھتے ہیں، مگر یہ مسائل کہاں سے پھوٹ پڑتے ہیں اور ممکنہ طور پر ان مسائل کا حل کس پاس ہے۔۔۔ اس کے لیے انھوں نے ایک الگ اسلوب اپنایا ہے۔

جس طرح وکلاء، سیاست دان، انجنیئرز، پروفیسرز اور ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد کی اپنی زبان اور پہچان ہوا کرتی ہے، اسی طرح ادیبوں کی بھی اپنی ایک زبان اور پہچان ہے۔ یہ وہ پہچان ہے جسے میر، غالب اور اقبال باقی عوام سے منفرد نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں دیکھا جائے تو آغا گل کا اسلوب اور زبان دیگر بلوچستانی لکھاریوں سے بھی یک سر مختلف ہے۔

آغا گل کی مشکل پسندی کے کئی زاویے ہیں۔ سب سے پہلے ایک بیوروکریٹ ہونے کے باوجود انھوں نے ادب کی پر خار وادی میں بھی قدم رکھا ہے، یہ بہت بڑی جرات ہے۔ دوسرا اہم زاویہ یہ ہے کہ بلوچستان پر افسانوی ادب کے لباس میں سچ لکھنا بہ ذات خود ایک بہت بڑا کٹھن امر ہے۔ تیسرا زاویہ یہ ہے کہ بلوچستان جیسے کثیر اللسان اور کثیر الثقافتی خطے کے لیے مقبول ہونے کے بجائے قبول ہونا کسی جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ چوتھا زاویہ یہ ہے کہ آج کل کے اس لسانی تطہیری ماحول میں اپنی ادبی بقا قائم و دائم رکھنا بھی ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ آخری زاویہ یہ ہے کہ ادب کے سرکاری مگر مچھوں کے جبڑوں اور

زنبوروں کے چھتوں سے اپنی فکر اور تحریروں کو مامون و محفوظ رکھنے کے لیے انھوں نے اپنے اسلوب اور زبان کو ناقابل تسخیر بنایا ہے۔

اپنے جاندار اور باغیانہ خیالات واحساسات کے سرِعام اظہار کے لیے انھوں نے دوراز کار علامتوں، نامانوس تشبیہات و استعارات اور ثقیل تاریخی حوالوں سے کام لیا ہے۔ راقم الحروف نے خود اس سے پہلے انجیل، تورات، زبور اور بھگوت گیتا کا تفصیلی مطالعہ نہیں کیا تھا، مگر آغا گل پر لکھنے کے لیے اخلاقی جرات کے ساتھ ساتھ علمی شناوری کی بھی اشد ضرورت پڑی۔ ان کے افسانوں اور ناولوں میں لاتعداد ایسے الفاظ بھی شامل تھے جس کے لیے مجھے اپنے دوستوں، لغت اور گوگل سے مدد لینا پڑی۔ جب میں نے اس بابت آغا گل سے پوچھا، تو کہنے لگے" :

میں مشکل نہیں لکھتا، مجھ سے مشکل لکھا جاتا ہے۔ میں عام لوگوں کے لیے نہیں لکھتا۔ جان ملٹن بھی کبھی بیسٹ سیلر نہ رہا، مگر ہر صدی میں موجود رہتا ہے۔ مختلف Segments کی اپنی زبان، لہجہ اور ذخیرہ الفاظ ہوا کرتا ہے۔ میں فسانہ آزاد والا اسلوب نہیں اپنا سکتا۔"

آغا گل کی مشکل پسندی کی ایک اور وجہ ان کی اساطیری داستانی کردار نگاری ہے، جو عام قارئین اور طلبہ کو آسانی سے سمجھ نہیں آتی۔ قدیم مقامی روایات، حکایات اور داستانوں سے ان کی دل چسپی بچپن کے زمانے سے رہی ہے، جو بجا طور پر ان کو اپنے والد ماجد محمد اکبر خان سے فکری وراثت میں ملی ہے۔ یہ تمام تر اساطیری کردار بلوچستان کی مقامی تہذیبوں، تاریخی حوالوں اور جغرافیائی صداقتوں کے امین ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے سوا، غازی نورامینگل، دشت میں سفر اور فسانہ جنات ایک لحاظ سے بلوچستان کی اساطیری تاریخ کا خزینہ ہیں۔ تاہم بابو، بیلہ اور کافر عشقم بھی مقامی روایات اور حکایات سے بھرپور ہیں۔

ان کے افسانوں کے اکثر نام اردو اور انگریزی زبان کے برعکس، براہوی، بلوچی اور پشتو زبان میں رکھے گئے ہیں۔ سرکک، بوانٹو، گنوک، کماش، مسیت ناپاٹ، حقل دما، پوسکنگِ خنک، پیماز، ھلی، گوانگو، گوریچ، لوح لاعیٔ، کھلی والا، بدروج، فدوا،

باھوٹ، پوغٹ، شوم کامال، کورہ کئی اور چار گل وغیرہ الفاظ سمجھنے کے لیے بلوچستان میں بولی جانے والی زبانوں سے شناسائی بھی ضروری ہے۔ کوئی اندازہ لگا سکتا ہے کہ اگر صرف ان کے افسانوں کے اسماء کے معنی سمجھنے کے لیے بڑی محنت درکار ہوتی تو پھر ان افسانوں کے مفاہیم سمجھنے کے لیے کتنی ریاضت درکار ہو گی۔

اسی طرح آغا گل رومانیت پر مکمل اعتقاد رکھنے والی شخصیت ہیں۔ نسوانی حسن وجمال ان کی تحریروں کے لیے نہ صرف بہترین محرک ہے، بل کہ آتش گیر مادے کا کام بھی کرتا ہے۔ پہاڑوں، دریاؤں، میدانوں اور صحراؤں میں بھی ان کو نسوانی حسن نظر آتا ہے۔تکتو، میان غنڈی، رانی اور خلیفت پہاڑوں میں نسوانی حسن تلاش کرنے کے لیے بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ چشم ہو تو یہ دہر آئینہ خانہ ہے پھر دیواروں کے پیچ بھی منہ نظر آنے لگتے ہیں۔

ان کے افسانوں اور ناولوں میں قرآن، انجیل، تورات، اویستا، بھگوت گیتا اور دیگر اتنے نادر مشکل الفاظ شامل ہیں کہ بعض اوقات متن کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ تاہم مجھے "تالیتا کومی!" اور "ایلیاہ ایلیاہ لما شبقتنی!" بہت پسند ہیں۔

آغا گل کی تحریروں میں انگریزی الفاظ بھی نہایت کثرت سے ملتے ہیں۔ ان کو ایک زبان کے معروف الفاظ کے لیے دوسری زبان میں مترادف یا متبادل الفاظ استعمال کرنے کی عادت نہیں ہے۔ ان کی تحریروں کو سمجھنے کے لیے سیاست، تاریخ، ادب، مذہب، سائنس، قانون اور جغرافیہ کے علوم سے بھی شناسائی ضروری ہے۔ بہ طور مثال یہاں صرف چند الفاظ کو دہرایا جاتا ہے تاکہ نشر مکرر نہ ہو۔

El Nino, La Nina, Logistic Support, Metabolism, Nostalgia, Sadist, Petition, Axial Belt, Continental Shelves, De Jure, De Facto, Penelope's Web, Achilles Heel, etc.

انھوں نے اس نوع کے کئی الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اب اگر قاری کو ان الفاظ، اصطلاحات اور محاورات کے معنی، مفہوم اور بیک گراؤنڈ معلوم نہ ہو تو وہ نہ صرف فن پارے کے لطف سے محروم رہے گا / گی، بل کہ جاہل مطلق کا طالب بھی بنے گا / گی۔

ان کے بعض افسانوں کا اختتام اگرچہ ہنسی، مذاق، ظرافت اور تفریح پر ہوتا ہے جس سے عارضی طور پر کھتارسس ہو جاتی ہے، مگر اکثر افسانوں کا اختتام ٹھٹھہ بازی اور ٹھٹھول اڑانے کے بجائے طنز، نشتر زنی، سبق آموزی اور عبرت انگیزی پر ہوتا ہے جس سے ایک طویل مدت کے لیے طبیعت مکدر اور دل بوجھل ہو جاتا ہے۔ اس نوع کی وحدت تاثر کے انجذاب کے لیے قاری میں برداشت اور حوصلے کا موجود ہونا بہت ضروری ہے، ورنہ وہ ایک انمول فن پارے کو لایعنی سمجھ کر خود بھی لایعنیت کا شکار ہو جاتا ہے۔

آغا گل کے فن پاروں کا مزاج Volatile ہے۔ وہ لمحے بھر میں ہنسی سے لوٹ پھوٹ کراتا ہے اور لمحے بھر میں صدمے سے دوچار بھی کرا سکتا ہے۔ اس ناگہاں ہیجان خیزی سے قاری اور ناقد دونوں کو چوکنا رہنا ہو گا۔

ان کی مشکل پسندی کے معمے کو حل کرنے کے لیے کوئی "کھل جا سم سم" نہیں ہے، مگر کتاب کے آخر میں "فرہنگ" کے نام سے اس بابت ادنیٰ سی کوشش ضرور کی ہے۔ تاہم، آغا گل کا قاری ہو یا مجموعی طور پر ادب کا قاری۔۔۔ قاری کا بہ ہر صورت تعلیم یافتہ ہونا اور نقاد کا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا از حد ضروری ہے۔

آغا گل کی ناول نگاری

ناول اطالوی زبان کا لفظ ہے جس میں اٹلی والے روز مرہ زندگی کے معمولی واقعات، رزمیہ قصے، گھریلو کہانیاں، مقامی گیت اور سیاحتی محفلوں کو مسلسل اور مربوط انداز میں نظم اور نثر کی شکل میں یاد کرتے تھے۔ فرانس میں لمبی داستانوں کے قدیم ترین نمونوں کو 'دلاوری گیت' یعنی ناویلا کہا جاتا تھا۔ اردو میں ناول انگریزی ادب سے آیا ہے، اور اردو ادب میں جدید اور کامیاب ناولوں کا ایک بے بہا ذخیرہ موجود ہے۔ بلوچستان میں ناول اگرچہ کم لکھے گئے ہیں، مگر ان کم لکھنے والوں میں آغا گل بھی شامل ہیں۔

ناول نگاری میں ایسے نثری قصے ہوتے ہیں جن کی سرحدیں تاریخ سے ملتی ہیں۔ ناول میں زندگی کی ترجمانی بیان کے ذریعے کی جاتی ہے۔ ناول میں زندگی کے چہرے سے پہلے نقاب اٹھایا جاتا ہے اور بعد میں دوسروں کو دکھایا جاتا ہے۔ ناول کی پہلی حیثیت ادبی شہکاریت اور ثانوی حیثیت آلہ ترغیب ہوتی ہے۔ ناول میں افسانے کی طرح پلاٹ، کردار، بیانیہ انداز، منطقی تسلسل اور کہانی در کہانی ہوتی ہے۔ عموماً افسانے کی زبان آراستہ اور پر تکلف ہوتی ہے، اور اس میں ایسا واقعہ بیان کیا جاتا ہے جو نہ کبھی گزرا ہو اور نہ کبھی گزرنے کا امکان ہو، جب کہ ناول میں روزمرہ زندگی کی عام کہانی بیان کی جاتی ہے۔ ناول نیم تاریخی اور نیم تخیلاتی ہوتا ہے۔ افسانوں اور ڈراموں میں کردار بادشاہ، مذہبی پیشوا، امراء اور سردار ہیں، جب کہ ناول میں کردار عام لوگ ہوتے ہیں، اور یہ بنی نوع انسان کی دلچسپیوں کے لیے سب کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ ناول موضوع اور کردار کے حوالے سے جمہوریت پسند ہے۔ اس میں عام لوگوں کی زندگی کی تصویر کشی ہوتی ہے، اور اس کے آئینے میں ہر معمولی پڑھنے والا دیکھ سکتا ہے۔ ناول کا لکھاری اور قاری دونوں عام عوام ہوتے ہیں۔ ناول میں جگ بیتی آپ بیتی اور آپ بیتی جگ بیتی بنتی ہے۔ مجموعی طور پر ناول ایک ایسا نثری قصہ ہے جس میں حیات انسانی کے معمولی لیکن موثر روزمرہ پیش آنے والے واقعات کو سادہ اور سلیس انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

آغا گل نے افسانوں کی طرح ناولوں میں بھی بلوچستان کے سماجی، سیاسی، معاشی اور مذہبی در پردہ حقائق سے پردہ ہٹایا ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں بلوچستان میں رہنے والی مختلف اقوام کی بود و باش، رہن سہن، تہذیب و تمدن، وسائل و مسائل اور پسند و ناپسند کا تفصیلی خاکہ پیش کیا ہے۔ ان کے ناولوں میں بلوچستانی زندگی کی داستان کو اپنے سارے تعلقات اور تنوعات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ان کے معاصر ادیبوں کے ہاں 'تقسیم' کی اذیت پائی جاتی ہے، مگر ان کے ہاں 'الحاق' (بلوچستان کا پاکستان کا حصہ ہونا) کا صدمہ شدت سے محسوس کیا جاتا ہے۔ انھوں نے افسانوی ادب کا رشتہ بلوچستانی تہذیب سے جوڑا ہے۔

بیلہ، بابو، دشت کا سفر اور کافر عشقم رومانوی ناول ہیں، جب کہ غازی نورا مینگل اور فسانہ جنات تاریخی ناول ہیں؛ یعنی ناول کم، تاریخ زیادہ۔ ماقبل آخر دو ناولوں میں فکر اور فن میں اعتدال نہیں رکھا گیا ہے، مگر ان میں جو تاریخ بیان کی گئی ہے وہ بہ ذات خود ایک فن ہے۔ غازی نورا مینگل اور فسانہ جنات دونوں رزمیہ ناول ہیں۔

افسانوں کی طرح ناولوں میں بھی آغا گل کوئٹہ میں بولی جانے والی زبان استعمال کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کی حتمی رائے ہے:

"جہاں تک زبان کا تعلق ہے، مروجہ انداز سے میں بچ کر چلتا ہوں۔ یہ بلوچستان کی اردو کا اثر ہے، یا اپنی طبیعت کا۔ اگر یہ غلطی ہے تو یہ ایک شعوری غلطی ہے۔ جس میں میری پسند شامل ہے۔ اصل چیز جذبوں کا اظہار ہے۔ لفظ جس قدر سمبالک ہوں بہتر ہے۔ ایک روز انسان اس قدر ارتقا کرلے گا کہ لفظ ختم ہو جائیں، صرف سمبل رہ جائیں گے۔"

بیلہ، بابو، دشت کا سفر، غازی نورا مینگل اور فسانہ جنات ان کے مشہور ناول ہیں۔ یہاں ان ناولوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالی جاتی ہے۔

- **بیلہ**

اس ناول کے کرداروں میں رحمان (کوچ ڈرائیور)، بیلہ (ایک حسین جوان فی میل میڈیکل اسٹوڈنٹ کا فرضی نام)، سیٹھ شمروز (کوچ کمپنی کا مالک)، سلمان (ڈرگ مافیا)، ڈاکٹر سرور (سرجن)، خدو (رحمان کا وفادار کلینر) اور کامریڈ (دیہاتی انقلابی نوجوان جو تازہ تازہ جیل سے رہا ہوا ہے) شامل ہیں۔

رحمان بیلہ پر عاشق ہوتا ہے اور بیلہ کے تمام تعلیمی اخراجات کے ساتھ ساتھ اس کے ناز و نخرے بھی اٹھاتا ہے۔ اس سے پہلے رحمان ایک ہنس مکھ اور البیلا ڈرائیور تھا۔ شمروز اس کو اپنا بیٹا کہہ کر پکارتا تھا۔ بہ حیثیت کوچ ڈرائیور رحمان کا کوئی ثانی نہیں۔ ہر کوئی رحمان کی ڈرائیوری اور اخلاق سے متاثر ہے، لیکن بیلا ڈونا کی آمد نے رحمان کو یک سر تبدیل کر دیا، اور رحمان کے اخراجات بھی بڑھ گئے۔ سیٹھ کو رحمان کی فکر لاحق ہوتی ہے، کیوں کہ اس کے والد اور چچا بلوچستان کی آزادی کی جنگ میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور رحمان کے سر سے نانی کا سایہ بھی اٹھ جاتا ہے۔ یوں رحمان غربت اور محبت کے درمیان میں پھنس جاتا ہے۔

ڈاکٹر سرور بار بار رحمان کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ اس محبت سے باز آؤ، میڈیکل کی لڑکیوں کو اسٹڈی کے دوران میں شوہر نہیں سپورٹر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو نہی بیلا ڈاکٹر بن جائے گی، تو تمھیں نظر انداز کر کے کسی پروفیشنل ڈاکٹر سے شادی کرے گی، پیسہ بنانے کے چکر میں پڑ جائے گی اور تم ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔ رحمان پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ ڈاکٹر سرور کی رحمان کو ہدایت شاید ہر کسی کے لیے ہدایت ہو" : پیارے رحمان! یہ شادی ناکام رہے گی چلے گی نہیں۔ آزار بن جائے گی۔ تم دونوں کی شادی اگر ہوئی بھی تو سخت ناکام رہے گی۔ عمر کا فرق ہے، کلچر کا فرق ہے۔ نرسیں عموماً کئی مرد پالتی ہیں جو انہیں سپورٹ کرتے ہیں۔ عمر میں ان سے بڑے ہوتے ہیں۔ اسٹیبلش ہوتے ہیں۔ پھر ایک پپو ٹائپ چاکلیٹ ہیرو سے شادی کر لیتی ہیں۔"

شمروز کو بھی رحمان کی محبت کا علم ہو چکا تھا، مگر شمروز نے ایک رحم دل باپ کی مانند رحمان کو مشورہ دیا کہ بیلہ کے ساتھ شادی کر و خرچہ وہ خود ادا کرے گا۔ جب بیلہ فی الحال شادی کے لیے تیار نہ ہوئی تو رحمان دل برداشتہ ہو کر کچھ عرصے کے لیے اپنے آبائی گاؤں چلا گیا۔ گاؤں میں غربت اور بدحالی عروج پر تھی۔ وہاں رحمان نے اپنی ساری کہانی کامریڈ سے شریک کی اور کامریڈ نے مشورہ دیا کہ اعلیٰ مقاصد کے لیے جینا سیکھو، اسکول کھولو، ڈسپنسری کھولو یا کوئی اور عوامی خدمت کرو۔ محبتیں اور شادیاں ادنیٰ مقاصد ہیں۔ کامریڈ کی رحمان سے گفت گو سن لیں۔ یہ صرف مکالمہ نہیں، فلسفہ بھی ہے:

"بلوچستان میں بھی ان علاقوں نے ترقی کی ہے جہاں ہائی سکول تھے۔ بارنس ہائی سکول سبی 1888 میں قائم ہوا، نوشکی اور تربت کے سکول، مستونگ کا ہائی سکول۔ سکول اور کالج کا ترقی سے گہرا تعلق ہوا کرتا ہے۔ گھر میں سکول قائم کر دو۔ بیلہ کو سگریٹ نوشی کی طرح غیر اہم کر دو۔"

بلآخر رحمان نے اپنے ویران گھر میں سکول کھولنے کا اعلان کیا، اور بیلہ کی محبت نے بہت جلد اس کو واپس کوئٹہ آنے پر مجبور کیا۔ اسکول کے قیام سے ممکنہ طور پر کون کون سی تبدیلیاں آسکتی ہیں، رحمان کا خواب پڑھ لیں:

"اس نے دیکھا کہ ننھے منے بچے سکول میں پڑھ رہے ہیں۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ افسر بن رہے ہیں۔ فوجی وردیاں پہنے شان سے پھر رہے ہیں۔ حسب روایت ان کے سینے تمغوں سے سجے ہوئے ہیں۔ تمغے ہی تمغے، ہر سال نئے تمغے۔ وہ حمید بلوچ کو پھانسی گھاٹ سے زندہ واپس لا رہے ہیں۔ انہوں نے پھانسی گھاٹ توڑ ڈالا اپنے بوٹوں سے۔ انہوں نے جلادوں کو کچل ڈالا۔ جو نواب نوروز خان اور اس کے ساتھیوں کو پھانسی دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے ساری جیلیں توڑ ڈالیں۔ ہر چیک پوسٹ اکھاڑ پھینکی، جہاں بلحاظ مرد و زن انسانوں کی تذلیل کی جاتی تھی۔ عقوبت خانے ڈھا دیے پھر وہ رحمان کو سلامی دیتے ہوئے گزرنے لگے، اور ٹینک آئے، اور پھر جہاز آئے، گھن گرج کے ساتھ امریکی جہاز امریکی ٹینک امریکی اسلحہ۔"

اس دوران میں رحمان کا سلمان کے ساتھ تعلق بنا، سیٹھ شمروز کے جواں سالہ بیٹے کا قتل ہوا، اور رحمان نے اس قتل کے بدلہ لینے کی قسم کھائی۔ یوں رحمان نے پے درپے دو قتل کیے۔ دوسری طرف سلمان کی کوشش تھی کہ بیلہ کو اپنا لے اور شمروز کی دولت پر بھی ہاتھ صاف کریں۔ اس منصوبے کو بھی رحمان نے ناکام بنایا، سلمان بھی نہ رہا اور وہ خود بھی پھر نظر نہیں آیا۔

چھے سال بعد ڈاکٹر سرور سے ایک نابینا شخص ملتا ہے اور ڈاکٹر پوری روداد حرف بہ حرف سناتا ہے۔ ڈاکٹر کھانے پینے کا بندوبست کرتا ہے، مگر وہاں نابینا کے بجائے ایک مختصر خط پڑا ملتا ہے:

"میری موت نے مجھے ہیرو بنا دیا ہے۔ مجھے زندہ مت کرنا۔ میں دوسری بار مرنا نہیں چاہتا۔"

یہ نہایت دل چسپ ناول ہے۔ اس میں ڈرائیوروں اور سیٹھ کے درمیان باہمی تعلقات، ڈرائیوروں کی طرز زندگی، ان کے مسائل، پولیس، لیویز اور کوسٹ گارڈ کے اہل کاروں سے چھیڑ چھاڑ، سواریوں کے ساتھ رویہ اور سمگلنگ کے طریقے بھی سپرد قلم کیے گئے ہیں۔ کوئٹہ سے کراچی تک کے سفر کا احوال، سڑکوں کی حالت زار، ہوٹلوں کے لذیذ کھانوں کا ذکر، چیک پوسٹوں سے گزرنے کی اذیت اور ڈرائیوروں کی آپس میں تیز رفتاری کے مقابلے اور سب سے بڑھ کر ڈرائیوروں کی محبت کی خوب صورت عکاسی کی گئی ہے۔ رحمان نے ڈرائیوری اور عاشقی دونوں اس دھج سے کی کہ ہمیشہ کے لیے امر رہا—یعنی زندہ ہو کے مرا اور مر کے بھی زندہ رہا۔

ناول کو خصوصاً کوئٹہ میں بولی جانے والی اردو زبان میں لکھا ہے۔ بلوچستانی ڈرائیوروں اور سیٹھ کی باہمی محبت اور اقدار سے اس جغرافیے کی مٹھاس کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی طرح کامریڈ کی شکل میں جوانوں کا باشعور ہونا، ڈاکٹر سرور کی شکل میں سمجھ دار ڈاکٹر کا وجود رکھنا اور بیلہ کی شکل میں لڑکیوں کا ہر قیمت پر میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنا—یہ سب بلوچستان کے رنگوں میں سے ہیں۔

"یہ رحمان استاد ہے۔ گولی کی طرح گاڑی چلاتا ہے۔ لائن کا سب سے تیز رفتار ڈرائیور ہے۔ جو کوچ ایک گھنٹہ پہلے نکلے تھے یہ انہیں وڈھ کے قریب پکڑ لے گا۔ دیکھ لینا۔ آئندہ صرف ہماری کمپنی میں سفر کرنا باقی سب کھٹارے ہیں۔"

- **بابو**

بابو کوئٹہ میں رہنے والے ایک آبادکار اور نان لوکل خوش شکل نوجوان (بابو) کی نان اسٹاف عشقیہ کہانی ہے۔ بابو ایک سرکاری ملازم کا بیٹا اور تین بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ وہ لاڈلا ہے، تھڑوں پر اپنے دوستوں کے ساتھ گپ شپ لگاتا ہے، محبت کرتا ہے، اپنی محبوبہ کو خطوط در خطوط بھیجتا ہے، اور اس کی ضد ہے کہ ہر قیمت پر اپنی محبت سے مل جائے۔ پہلی محبت شازیہ سے ہو جاتی ہے، مگر شازیہ ان کی قسمت میں نہیں ہوتی۔ دوسری محبت نسیم سے ہو جاتی ہے، مگر ان کے قدامت پرست والدین رضامند نہیں ہوتے۔ ان کے دوست ان کو طرح طرح کے مشورے دیتے ہیں کہ کسی طرح ان کے والدین راضی ہو جائیں۔ اس دوران میں وہ کئی دفعہ خودکشی کی کوشش بھی کرتا ہے، مگر دوست وہی جو مصیبت میں کام آئے۔

بعد میں یہ شادی ہو جاتی ہے، مگر کہاں ایک مسٹریس اور کہاں ایک کلرک!

اس ناول کی اصل خوبی اس ناول کا کوئٹہ کی زبان میں لکھنا ہے، اور ساتھ ساتھ کوئٹہ کے نوجوانوں کے ایک دوسرے سے بے لوث پیار ہے۔ ویسے پورے ناول پڑھنے کا جو لطف ہے وہ تشریح میں کہاں۔

بابو ناول کے فکر و فن پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے سید عبدالوحید فانی لکھتے ہیں کہ:

ناول 'بابو' اردو ادب میں ایک اہم مقام رکھتا ہے، جو بلوچستان کی ثقافت، سماج اور مذہب کی عکاسی کرتا ہے۔ ساتھ ہی پورے ناول میں قاری کو کوئٹہ شہر کا مخصوص رنگارنگی اور چہل پہل دکھائی دیتی ہے۔ خود آغا گل ناول کی ابتدا میں کوئٹہ کا تاریخی منظر نامہ اس طرح بیان کرتا ہے کہ قاری کو تصور میں اس کا سیر کرا دیتا ہے۔

"کوئٹہ میں ہر روز، روزِ عید، ہر شب، شبِ برات کا عالم تھا۔

سٹیج ڈرامے، پھلوں کی خوشبو، پرندوں کی نمائش، چکوروں کی لڑائیاں، بیڑوں کے دنگل، بروری نالے میں چرخ، کتوں، ریچھوں کی لڑائیاں، پتنگ بازی، ٹیلو، بڑی، باڑی، لگن میٹی، اونچ نیچ، رسی ٹاپنے کے مقابلے۔ سہ پہر میں سبھی تفریح دیکھنے

نکل پڑتے۔ چھاؤنی کے درختوں کے نیچے مختلف ٹولیاں آبیٹھتیں۔ جو اپنے چکور بھی اپنے ساتھ لے آتے۔ شعر خوانی ہوتی۔ بیت بازی کے مقابلے عام تھے۔گھروں میں والدین اپنے بچوں کے ساتھ بیت بازی کرتے۔ گرمیوں میں قوال چلے آتے۔ پتلیوں کے تماشے گھر گھر ہوتے۔ گڈوی والیاں سڑکوں پہ گڈوی بجابجا کر انعام وصول کرتیں۔فٹ بال کے میچ ہوتے۔"

چونکہ کوئٹہ میں سات قومی زبانیں بولی جاتی ہیں، جن میں اردو ایک باہم لسانی رشتے کا کام کرتی ہے اور یہاں کی اردو اپنے خاص لہجے کے لیے مشہور ہے۔ آغا گل نے بھی اس ناول میں علاقائی زبان، جیسے پشتو، براہوی اور بلوچی، کے الفاظ اور ان کے لہجے میں بولی جانے والی اردو کے الفاظ اس کثرت سے استعمال کیے ہیں کہ وہ اجنبیت کا احساس دلانے کے بجائے ان کے ناول کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہیں۔ کوئٹہ کی متین اردو کے مخصوص الفاظ، اصطلاحات، محاورے اور روزمرے استعمال کیے ہیں، جیسا کہ ڈرامابازکے لیے "پاٹ باز"، نقصان پہنچانا کے لیے "بیخ نکل جانا"، ضرور کے لیے "باید" اور آوارہ گرد کے لیے "لغڑی" کے جیسے مقامی الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ سب اس ناول میں مزاحیہ عنصر کا اضافہ کرتی ہیں، اور کوئٹہ کے خوبصورت امتزاجی کلچر سے ہم آہنگ کرتی ہیں۔ لیکن اس ناول سے زیادہ لطف اٹھانے کے لیے قاری کو یہاں کے مقامی زبان اور ثقافت سے واقف ہونا لازمی ہے۔ اس بات کا اعتراف آغا گل خود کرتے ہیں:

"میرے افسانوں (تحریروں) کو سمجھنے کے لیے کوئٹہ کے گلی کوچوں کی زبان سے شناسائی ازحد ضروری ہے۔"

ناول کی نثر سادہ اور سمجھنے میں آسان ہے، مگر اس میں گہرائی اور معنویت ہے۔ پلاٹ بھی مضبوط ہے جس میں بابو کی ذاتی زندگی کو بہت ہی پرکشش انداز میں پیش کیا گیا ہے اور تمام تر واقعات کو ایک مکانی اور زمانی ترتیب و تسلسل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جو قاری کو اختتام تک اپنے ساتھ بہاکے لے جاتا ہے۔

اس ناول میں سماجی حقیقتوں، طبقاتی فرق اور ذاتی جدوجہد کو بڑی مہارت کے ساتھ سامنے لایا گیا ہے۔ کرداروں کی نفسیات، ان کے معاشرتی مسائل اور باہمی تعلقات کی تفصیلات کو اس خوبصورتی سے بیان کی گیا ہے کہ قاری ان کے جذبات اور مسائل کو قریب سے محسوس کرتا ہے۔ یہ ناول نہ صرف بلوچستان کی ثقافت اور اجتماعی مسائل کی عکاسی کرتا ہے، بلکہ آفاقی

سطح پر انسانی جذبات، محبت، جدوجہد اور ناکامیوں کی کہانی بھی پیش کرتا ہے۔ اور قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ کس طرح سماجی توقعات اور خاندانی دباؤ ایک فرد کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس میں سماجی عدمِ انصاف اور فرد کی ذاتی خواہشات کے درمیان توازن تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فلسفیانہ طور پر انسان کی فطرت اور معاشرتی نظام کی کشمکش کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی بعض جگہوں پر وجودیت اور بے معنویت کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اور بابو کا معاشرے اور خاندان کے قدامت پسند روایات سے روگردانی کرنا اور اس کے خلاف آواز اٹھانا جدیدیت کی عکاسی کرتا ہے۔ اور روحانی فضا کے ساتھ ساتھ ناول میں فرقہ واریت کے خاتمے، مذہبی اجتماعیت اور فکری وحدت کی دعوت بھی موجود ہے، جہاں بابو وصال عشق کے لیے کوئٹہ کے گردونواح میں موجود مشہور بزرگان تصوف کے مزارات پر حاضری دیتا رہتا ہے اور ساتھ ہی محرم کے جلوس اور ماتموں میں بھی شرکت کرتا رہتا ہے۔

قومیت کی بنیاد پر طبقاتی فرق اور اس کے تحت شادی کرانے سے انکار کرنا، ہمارا سب سے بڑا المیہ ہے جسے ناول میں اس طرح دکھایا گیا ہے۔

"شازیہ کا گھرانہ چاہتا تھا کہ شازیہ کی شادی بابو سے کر دی جائے مگر بابو کی والدہ کسی راجھستانی لڑکی کی راہ دیکھ رہی تھی۔ ایسی لڑکی جو ان کی اپنی ہو۔"

مذہبی روحانیت کی جھلک ان اقتباسات میں صاف نظر آتی ہے۔

"کالج کے سامنے بی بی نانی کا مزار تھا۔ جہاں سے وہ منت والے رومال چرایا کرتے تھے اور کھانے کی چیزیں بھی اٹھالیا کرتے۔ آخر وہ بی بی کے معتقد تھے۔ حسینائیں بھی بڑی عقیدت سے مزار کے جھنڈوں پہ رومال باندھ کے جایا کرتیں کہ ان کا روٹھا محبوب لوٹ آئے یا جس لغڑی کو وہ چاہتی ہیں، اس سے شادی ہو جائے۔"

"وہ حسینوں کو حاصل کرنے کے لیے مختلف مزاروں پر ان کی منت کے لیے بلی مار کہ اگربتیاں جلاتے پھرتے۔ بزرگان تصوف سے ان کے خوش گوار تعلقات تھے۔"

اس کے علاوہ مذہبی فکری وحدت لانے کے لیے بھی واضح اشارے ملتے ہیں۔

"محرم میں دوست امام بار گاہوں میں جایا کرتے۔ وہاں کھانے پینے کو مفت ملتا۔ شربت اور کھیر تو بے حساب ملتے۔ سنی حضرات بھی دیگیں پکوا کر سڑکوں پر تقسیم کرتے۔ 'نذرِ مولا، نیازِ حسین' کے نعرے لگاتے، امام بار گاہوں میں داخل ہو جایا کرتے۔"

"گھوڑے (ناول میں موجود ایک کردار کا خطاب) کو ایک ایک امام بار گاہ کا محل و قوع یاد تھا۔ اتنا علم کسی سنی تو کیا کسی راسخ العقیدہ شیعہ کے پاس بھی نہ ہوتا۔ تین راتیں محلے محلے امام بار گاہوں میں اگربتیاں جلاتے پھرتے، شمع روشن کرتے، دعائیں مانگتے رہتے۔ علموں کی زیارت کرتے۔ یہ سلسلہ نویں محرم پر منتج ہوتا۔"

"چھوٹے چھوٹے ماتمی دستے گلیوں میں منت کے عَلم لیے جاتے تو سنی حضرات سبیلیں لگا لیتے، کھیر بانٹتے اور التجائیں کر کے ماتمی دستوں کو شربت پینے کے لیے روکتے۔ بابو بھی ان اقدامات میں پیش پیش رہتا۔"

مجموعی طور پر "بابو" آغا گل کا ایک شاہکار ناول ہے، جو بلوچستان کی ثقافت، زبان، مذہبی فضا اور سماجی مسائل کو اجاگر کرتا ہے۔ اس ناول میں پیش کردہ کہانی، کرداروں کی نفسیات اور مصنف کی فنی مہارت، قاری کو متاثر کرتی ہے، اسے اردو ادب کا ایک قیمتی اثاثہ اور بلوچستان کے امتزاجی کلچر کا کوہ قامت استعارہ بناتی ہے۔

- **دشت میں سفر**

یہ ایک ناولٹ ہے، جس میں ایک جوان اور حسین طوائف کے ساتھ بہ یک وقت کئی دوستوں کی محبت، اور اس ہر جائی محبت کے المیے سے بھرپور انجام کو بیان کیا گیا ہے۔ ان کرداروں میں قاضی، نجیب اور غفار سرگرم کردار ہیں، جو طوائف رخسانہ کی زلفوں کے اسیر بن جاتے ہیں۔ دل چسپ نکتہ یہ ہے کہ سماجی گھٹن کے ساتھ ساتھ جن مردوں کی خانگی یعنی عائلی زندگی

تسلی بخش نہ ہو اور بیوی سے تعلقات کشیدہ ہو، اس صورت حال سے جنم لینے والے برے اثرات سے نہ صرف ان کی ذات، بیوی، بچے اور معاشرہ متاثر ہوتا ہے، بل کہ جرائم اور طوائفیت بھی اسی کی زائیدہ ہوتی ہے۔

رخسانہ جن سماجی مجبوریوں کی وجہ سے پہلے کم عمری میں شادی شدہ، پھر محدود پیمانے پر برائے فروخت، بعد میں ایک تجربہ کار طوائف، آخر میں قاتل—اور سب سے بڑھ کر محض ایک اکیلی اور شکست خوردہ عورت بن جاتی ہے۔ قاضی کو زندگی میں مایوسی، غفار کو موت اور نجیب کو بھی موت، مگر محبت بھری موت—جس کی ان کو ہر گز توقع نہ تھی۔ طوائفوں کے ساتھ جعلی محبت کی شاید گارنٹی ہو، مگر کامیاب شادی کی کوئی گارنٹی نہیں ہوتی۔ جو لوگ طوائفوں کے ساتھ محبت کی حد فاصل سے تجاوز کرتے ہیں، تو ان کا انجام اس ناولٹ میں پڑھا جا سکتا ہے۔ طوائفوں سے تعلقات رکھنے والے اپنا سب کچھ کھو دیتے ہیں، مگر طوائفوں کے لیے کھونے کا کچھ نہیں ہوتا، کیوں کہ وہ پہلے ہی سے سب کچھ کھو چکی ہوتی ہیں۔ طوائف خلا میں نہیں بنتیں۔ جو مرد طوائفیں تخلیق کرتے ہیں، وہی مرد ان کا پہلا شکار بنتے ہیں-یہ فطرت کا قانون ہے، اسے کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔

ناولٹ (دشت میں سفر) میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ محبتوں میں شرک کرنے کی گنجائش نہیں ہے، اور دوستوں کے ساتھ ذاتی نوع کے معاملات شریک کرنے کا نتیجہ بھی خطرناک ہوتا ہے۔ اندھادھند محبت دراصل انسان کو نہ صرف دولت، عزت اور شہرت سے محروم کر کے رکھ دیتا ہے، بل کہ زندگی سے بھی محروم کر دیتا ہے۔

"وقت کے اتھاہ ساگر میں وہ دونوں اکیلے اور تنہا رہ گئے۔

سمندر سسکیاں لیتا رہا۔

پھر رخسانہ کسی مجرم کی طرح سر جھکائے تھکے تھکے قدموں سے اس کے پاس پہنچی، آنسو پونچھے، اپنا سکارف کھولا اور اس کے قریب آ کر کمزور آواز میں بولی۔

"آؤ تمہارا زخم باندھ دوں۔"

لیکن اس کے سینے پر گول گول سرخ نشان بنا کر گزرنے والی گولیاں زندگی اپنے ساتھ ہی لے جا چکی تھیں۔

زندگی جو صرف ایک بار ملتی ہے۔"

نوٹ: یہی ناول 'دشت وفا' کے نام سے بھی آغا گل کے ناولوں میں شامل ہے، مگر آخر میں بڑی تبدیلی کے ساتھ۔ دشت میں سفر نامی ناول میں فرضی کردار 'نجیب' کی جگہے پر 'وہ' لکھا گیا ہے، اور دشت وفا میں 'وہ' کی جگہے پر نجیب لکھا ہے۔ دشت میں سفر کا اختتام یوں ہوتا ہے کہ رخسانہ اکیلی رہ جاتی ہے، جب کہ دشت وفا کے اختتام کو ایک نیا انجام دیا ہے۔ جس میں نجیب اور رخسانہ زندہ رہتے ہیں، پہاڑوں پر چلے جاتے ہیں، 'عظیم مقصد' کے لیے لڑتے لڑتے دونوں محبت کو امر کر کے اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

"جب ساتھی اور محافظ نجیب اور رخسانہ کی مدد کے لیے ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے اپنے ہی لہو میں بھیگے نجیب کو پہلو کے بل پایا۔ نجیب کے اوپر رخسانہ گری ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے عالم مایوسی میں نجیب کو بچانے کے لیے اس کے اوپر بچھ گئی ہو۔ رخسانہ کا سینہ گولیوں سے چھلنی ہو چکا تھا۔ رخسانہ کی کھلی آنکھیں آسمان پہ مرکوز تھیں۔

جہاں دور انسانوں سے بہت خالق رہتا ہے۔

جیسے رخسانہ آسمانوں میں مدد تلاش کر رہی ہو۔

یا جیسے خداوند یسوع مسیح آسمانوں سے اتر آئیں گے اور ہاتھ تھام کر کہیں گے۔

"تالیتا کومی۔"

تالیتا کومی کے معنی ہیں: "اٹھ اے لڑکی"

ایک ناول کے دو انجام: محبت کی روح کہاں سے کہاں تک پرواز کر گئی!

اس ناول میں کوئٹہ کا پر امن ماحول اور بے لوث دوستیاں اور لوگوں کی رجعت پسندی کے ساتھ ساتھ باہمی پیار اور محبت کا ذکر بھی موجود ہے۔

"بازار حسن میں آنے جانے والے ان ہوٹلوں میں گیت سنتے، کچھ روتے، کچھ خوش ہوتے۔

نہ لسانی تعصبات تھے، نہ مذہبی منافرتیں۔

انسان ہی انسان تھے۔

نفرتیں نہیں تھیں۔

بلاشبہ یہاں نفرتیں بوئی جا رہی تھیں۔

لیکن بلوچستان خشکابہ ہے۔

یہاں کوئی بیج بھی پنپ نہیں سکتا، نفرت کا ہی سہی۔

صحرا تو اور بےجنل ہیں۔

وہ اپنی اصلیت اپنی پاکیزگی قائم رکھتے ہیں۔"

وہ ایک افسانے میں لسانی نفرتوں سے تنگ آکر کہتے ہیں کہ انسانوں کی زبانیں ہی کاٹ دی جائیں تاکہ ہمیشہ کے لیے لسانی منافرت کا مسئلہ حل ہو جائے۔

- **غازی نورا مینگل**

یہ ایک رزمیہ براہوی نظم کا ترجمہ ہے، جس میں غازی نور محمد مینگل کی انگریزوں سے آزادی کے لیے جنگی مہمات کی تفصیلی کہانی بیان کی گئی ہے۔ کہانی کچھ یوں ہے:

بلوچستان میں براہوی ریاست 3مارچ1410 میں قائم ہوئی تھی، جو1947 میں اپنے اختتام کو پہنچی۔ برصغیر میں فرخ سیر نے 1717 میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو تجارتی محصول ادا کرنے سے مستثنیٰ کر دیا تھا۔ 1857 میں نو آبادیاتی مخالف جنگ یعنی آزادی کی جنگ ہوئی۔ نور محمد مینگل وڈھ میں دفعہ دار تھے، اور انگریزوں کے مذموم عزائم سے خوب واقف ہو گئے تھے۔ یوں سرکاری نوکری چھوڑ کر آزادی کے لیے انگریز مخالف جدوجہد شروع کر دی۔ یکے بعد دیگرے وڈھ، خضدار اور لسبیلہ پر پے در پے حملے کرتے رہے اور عوام بھی جوق در جوق اس مہم کا حصہ بنتے گئے۔

پولیٹیکل ایجنٹ قلات نے نورا مینگل کی گرفتاری کے کئی حکم جاری کیے، مگر غازی گرفتار نہ ہو سکا۔ 29جولائی1910 کو نورا مینگل نے ایک بار پھر خضدار پر حملہ کیا، گھمسان کا رن پڑا، اور غازی نے کہیں پناہ لے کر باھوٹ بنا۔ اس مجاہد کو باھوٹ بننے کے بعد اپنوں نے سرکار کے حوالے کیا۔ وہ گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا، عمر قید سنائی گئی، مگر20نومبر 1921 کو وہ قید ہی میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

آغا گل کہتے ہیں کہ 14، اگست 1947 کے پیچھے غازی نورا مینگل کی قربانیاں ہیں، اور جب ریڈ زونز اور ڈریکولاؤں سے پاکستان آزاد ہو گا، تب غازی نورا مینگل کو بہ حیثیت ہیرو تعلیمی نصاب میں پڑھایا جائے گا۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مجھے براہوی زبان نہیں آتی، مگر آغا گل نے اس نظم کا جو اردو ترجمہ کیا ہے وہ اتنی سلیس اور رواں ہے گویا آغا گل ہی نے یہ رزمیہ نثری نظم لکھی ہے۔ اور ہاں، انھوں نے نظم کے ترجمے سے پہلے آسان نثر میں پوری نظم کا خلاصہ بھی لکھا ہے۔

- **فسانہ جنات**

آغا گل لکھتے ہیں کہ 'فسانہ جنات' بلوچستان کی تاریخ کا اولین رزمیہ نثر ہے۔ رزمیہ نظم میں بہادری، جہد مسلسل اور جینے کا سلیقہ پایا جاتا ہے۔ اس رزمیہ نثر میں بھی ناول 'بابو' کی طرح سات زبانوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ میرے نزدیک فسانہ جنات دراصل بلوچستان کا عہد عتیق ہے، سوانح عمری ہے یا درد بیتی ہے۔ اس ناول کا سب سے بڑا حرکی سبب بلوچستانی زندگی پر سیاسی اثرات یعنی غیر ملکی سامراج اور سرمایہ دارانہ نظام کا براہِ راست مرتب ہونا ہے جس کی وجہ سے ارباب وطن کی بے بسی اور بدحالی اپنے عروج پر پہنچی۔

اس رزمیہ ناول میں وقتاً فوقتاً عربوں اور انگریزوں کی آمد، بلوچستان کے مشہور آبی دروں اور وادیوں کا ذکر، سندھ پشین اسٹیٹ ریلوے لائن کی تعمیر و تخریب، کاہان، کوہلو، درہ بولان اور درگئی کے پراسرار غاروں میں انگریزوں کو بیلوث کی مسلسل ناکام تلاش، بلوچ سرداروں کا انگریزوں کو بیلوث دینے سے صاف انکار، مریوں، بگٹیوں، سادات اور کاکڑوں کا انگریزوں کے خلاف اتحاد و اتفاق، انگریزوں کی مزاحمت اور خون ریزیاں، انگریزوں کا بلوچوں کو آپس میں لڑانا، مری قبیلے پر معاشی، سیاسی، اور سماجی پابندیاں، مریوں کا سر مچار بن کر اپنے حقوق کے لیے لڑنا، برطانوی سامراج کا بلوچوں کو مسلسل بھوک اور افلاس میں رکھنا، بلوچستان پر فوجی تسلط بر قرار رکھنا، بلوچستان کے جغرافیے کو مختلف حصوں میں بانٹنا، خان آف قلات کی تاج پوشی ہونا، بلوچستان کو وسائل سے مالامال صوبہ ظاہر کرنا اور اب تک بلوچستان میں افراتفری کا موجود رہنا—یہ سب کچھ آغا گل نے کاہان کے پراسرار غار میں موجود جنات شیلوخ، انوش، قیفان، محللی ایل، حنوک، متوشالح، لامک، اعوائیل، عیوش، تنکافیل اور حائیل کی زبانی بیان کیا ہے۔ اس رزمیہ ناول میں لفظ بیلوث اور مری پر تفصیلی بحث کرنے کے لیے انجیل، احبار، گنتی، استثنا، قضات، سموئیل، یسعیاہ، یرمیاہ، حزقی ایل، مکاشفہ، خروج، آستر، زبور، امثال، غزل الغزلات، متی، یوحنا، مرقس، یشوح، لوقا، پیدائش اور دیگر نامانوس اور حیران کن حوالوں کا ذکر بھی کیا ہے۔

بیلوث سے مراد حضرت علی کی تلوار ذوالفقار ہے، جو طاقت اور فتح کی علامت ہے۔ بیلوث سے مراد مذکورہ تلوار ہو نہ ہو، کم سے کم بلوچ غیرت، بہادری اور مزاحمت ضرور مراد ہے، جس سے انگریز ہر قیمت پر خریدنا چاہتے تھے، مگر اب تک یہ خواب ہی رہا ہے۔

"سفیر نے سردار سے عرض کی کہ تاج برطانیہ کو اس تلوار کی سخت ضرورت ہے جو کہ بیلوث کہلاتی ہے۔ یہ ایک پراسرار تلوار ہے۔ جس سے عجیب و غریب روایات وابستہ ہیں۔ یہ تلوار ایمان و طاقت کا مظہر ہے۔ جس قوم کے پاس یہ بیلوث ہو، اسے ہمیشہ فتح نصیب ہو گی۔"

'فسانہ جنات' میں مرقوم تاریخ سرکاری سطح پر ناپید ہے۔ اس رزمیہ ناول میں آغا گل نے علم اور معلومات کا ایک دریا بہایا ہے۔ اس دریا میں شناوری کیے بغیر بلوچستان کو سمجھنا ناممکن ہو گا۔ فسانہ جنات میں تاریخی، سیاسی اور مذہبی حوالوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ سیاسی حوالوں کے ساتھ ساتھ مذہبی معلومات بھی حیران کن ہیں۔ ایک مختصر پیراگراف ملاحظہ ہو:

"ہتھیار رکھنا سنت رسول اللہ ہے۔ حضور اکرمؐ کے پاس نو تلواریں تھیں: ماثور، عضب، قلعی، الیار، انخدہ، الرسوب، المخذم، القصیب، ذولفقار۔ زرہیں ساتھ تھیں: ذات الفضول، الوشیاغ، ذات الحواشی، السعیدہ، فضہ، البر، الخرق۔ کمانیں چھ تھیں: الزورا، الردصا، الصفرا، البیضا، اور الفتق۔ نیزے بھی دو تھے: المشوی، المثنیٰ۔ حربہ (چھوٹا نیزہ) تین تھے: البغہ، البیضا، الغزہ۔ خود ہیلمٹ بھی دو تھے: الموشح اور البسوع۔"

اور ہاں، اس ناول کے آخر میں آغا گل کی نیند اڑ جاتی ہے! ایسی نیند اور خواب ہر کسی کی قسمت میں کہاں!!!

• کافرِ عشقم

کافرِ عشقم آغا گل کا تازہ ترین رومانوی ناولٹ ہے، جس میں ملک سے باہر کوئٹہ والوں کی پر خلوص محبت کی عکاسی کی گئی ہے۔ ناول کا ہیرو فرید اور ہیروئین ایک خوب صورت گوری لڑکی کینوی ہے۔ متوازی کرداروں میں داروخان، بلال، اشیش، آرعیا اور اوبون شامل ہیں۔

ناولٹ کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ فرید کے بابا اور دادا اکبر خان کی خواہش ہے کہ اپنے اکلوتے وارث فرید کو بلوچستان میں جاری قتل و غارت، دہشت گردی، اغوا برائے تاوان، جبری گم شدگی اور ماورائے عدالت قتل سے بچا کر تھائی لینڈ میں اپنے جیولر دوست داروخان اچکزئی کے پاس بھیج دیں تا کہ وہاں وہ جیولری کا کام سیکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا قابل ہو جائیں۔ بابا اور دادا اکبر خان کو یقین تھا کہ اگر بٹوارے کے دوران میں وہ انڈیا سے ہجرت کر کے پاکستان نہ آتے تو اب وہ بلوائیوں کے ہاتھوں کب کے قتل ہو چکے ہوتے۔ اب چوں کہ بلوچستان میں حالات ٹھیک نہیں ہیں، تو فرید کو باہر بھیجنا ایک دانش مندانہ فیصلہ ہو گا۔ سو فرید داروخان کے ہاں تھائی لینڈ سدھار گیا۔

ناولٹ میں بلوچستان کے خراب حالات کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے، اور بعض اوقات تواتر سے یہ ذکر قاری کے ذوق سلیم پر گراں بھی گزرتا ہے۔ تاہم، جن حالات کا جس طرز سے جائزہ لیا گیا ہے، وہ مکمل مبنی بر حقیقت ہیں۔ ناولٹ میں دادا اکبر خان اور داروخان کو نہایت تجربہ کار اور سمجھ دار کرداروں کے بہ طور پیش کیا گیا ہے۔ دادا اکبر خان کہتے ہیں کہ بٹوارے کے بعد امریکا کو پاکستان کی شکل میں ایشیاء اور بحر ہند میں آپریٹر مل چکا ہے۔ اب امریکا کے لیے اس آپریٹر کی مدد سے وہاں کے وسائل پر قبضہ جمانا اور کمیونزم اور سوشلزم کو حرف آخر رکھنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ اور اس کار خیر کے لیے بھارت میں پنڈت ازم اور پاکستان میں ملا ازم خوب سر گرم رہے ہیں۔

فرید کا بابا چوں کہ خود بھی تین سال تک تھائی لینڈ میں رہا تھا اور اس کو یقین تھا کہ فرید داروخان کی سرپرستی میں ضرور کامیاب بن کر لوٹے گا۔ فرید کو ایئر پورٹ پر داروخان کے مارکیٹنگ آفیسر بلال نے خوش آمدید کہا۔ داروخان نے فرید کو

نصیحت کی کہ یہ دنیاوقت کے ساتھ ساتھ چلنے والے محنتی انسانوں کے لیے نہایت موزوں جگہ ہے اور تھائی لینڈ سیاحت اور سیکس پر چل رہاہے۔ لہذا حسین لڑکیوں کے ساتھ محتاط رہنا۔ داروخان نے مذید بتایا کہ ہجوم میں شرکت نہ کرنا، پاکستانیوں سے دور رہنااور پاکستانی لباس یعنی شلوار قمیض نہ پہننا۔

فرید نے جوں ہی مارکیٹنگ کالج میں داخلہ لیاتو وہاں ایک خوب صورت گوری کینوی سے سامنا ہوا۔ کینوی سے ملتے ہی فرید پگھل گیااور داروخان کی تمام تر نصیحتیں بھول گیا۔ عشق پر کسی کازور نہیں، سو فرید بھی کینوی پر فریفتہ ہو گیا۔ کینوی کا حسن کولواہ کی دوپہر، کلمت کی سہ پہراور گوادر کی شام جیسا تھا۔ فرید کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ایک حسین عورت آخر جونیپر کا کوئی پراسرار جنگل ہے، کوہ چلتن ہے، کوہ زرغون ہے یا کوہ خلیفت ہے؟ یہ کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں پر ختم ہوتی ہے؟ شاید حسین عورت کھل جاسم سم ہو۔ کینوی اور فرید اب ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتے اور کینوی نے فرید کو سارے بینکاک کی سیر بھی کرادی۔ کینوی نے فرید کو ہاسٹل کے بجائے اپنے گھر میں رہنے پر بھی مجبور کیااور فرید بھی کینوی کے شبستان میں

آباد ہونے لگا۔

فرید متوازی محبت کرنے میں بھی یکتا تھا۔ وہ پیڈپانگ (ہیرامنڈی) میں بھی ایک خوب صورت قتالہ اوبون کی محبت میں اسیر ہو چکا تھا، تاہم کینوی کی بات کچھ اور تھی۔ فرید نے محبت میں کینوی کا ایک لاکھ بھاٹ قرضہ بھی ادا کیا تھا۔ کینوی اب ہر لمحہ فرید پر نچھاور ہو رہی تھی۔

مارکیٹنگ کورس مکمل کرنے کے بعد اب فرید ایک ماہر جوہری بن چکا تھا۔ داروخان نے فرید کو جیولری کا کاروبار کرنے کے لیے واپس بلوچستان بھیجا۔ کینوی نے خودکشی کرنے کی دھمکی دی۔ فرید ہر لحاظ سے عاجز تھا کہ ایک بدھسٹ گوری عورت سے کس طرح شادی کریں۔ فرید ائیرپورٹ پہنچا، جہاز میں سوار ہوااور سیٹ پر بیٹھا۔ جہاز اڑان بھرتے ہی فرید کے ساتھ

ایک برقعہ پوش خاتون سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔ یہ کینوی تھی جو مشرف بہ اسلام ہو گئی تھی اور اب فرید کی بیوی بن کر باقی زندگی کوئٹہ میں گزارنا چاہتی تھی۔

ناولٹ میں طنز کے ساتھ ساتھ ظرافت اور فلسفے کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ عورت کے حسن کے متعلق لکھتے ہیں:

"ایک ماسٹر ڈگری حسن کی بھی ہونی چاہیے جو صرف حسین خواتین کو دے دی جائے۔ یہ ایک نئی ڈگری ہونی چاہیے جو سب ڈگریوں پر بھاری ہو۔"

"تھائی لینڈ کی معیشت اور خوش حالی کو عورتوں نے آسمان پہ چڑھا رکھا تھا۔ چھوٹی چھوٹی تھائیاں کیا قیامت ہیں۔ اگر بیس بیس فٹ کی ہوتیں تو ملک سپر پاور بن جاتا۔"

حسین عورتوں کے مختصر لباس کے متعلق لکھتے ہیں:

"سارا کپڑا تم لوگ لے گئے پہننے کے لیے۔ یہاں قحط پڑ گیا ہے کپڑے کا۔ یہ بیچاریاں دھاگے پہن کر پھر رہی ہیں۔ تین دھاگے فی لڑکی۔"

"قدرت نے لڑکی بنانا ہی تھا تو کچھ پرزہ پاٹ بھی لگاتا۔"

فلسفیانہ باتیں بھی ملاحظہ ہو،

"انسان تو کیا دیوتا بھی تعریف سے خوش ہوتا ہے۔"

"سارک ممالک کے لوگوں کو عموماً غریب سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے پیشہ ور لوگوں کو اپنی مالی حیثیت کے تعین میں خاصی دشواری پیش آتی ہے۔"

"جو اللہ سے ڈرے، وہ نیک کہلاتا ہے۔ جو سماج سے ڈرے، وہ شریف کہلاتا ہے۔ نیک نہ بن سکو تو شریف ضرور بننا۔"

"اسے پتہ ہوتا کہ پینی لوپ کی فرسٹ کزن ہے تو کبھی محبت نہ کرتا۔"

مجموعی طور پر ناولٹ کا پلاٹ سادہ اور کہانی دل چسپ ہے۔ ناولٹ میں بلوچستان کی جغرافیائی، سماجی، معاشی اور سیاسی صورت حال کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس ناولٹ میں آغا گل کے انقلابی نظریات میں کوئی تبدیلی دیکھنے کو نہیں ملتی، البتہ ان کے دیگر ناولوں اور افسانوں کے برعکس اس ناولٹ میں کوئٹہ وال اردو کے آثار کم ملتے ہیں۔ ایک بات قابل ذکر ہے کہ آغا گل نے خود ہی تھائی لینڈ سے مارکیٹنگ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ کہیں یہ وہی رومانوی روداد تو نہیں؟ واقعہ جو کچھ بھی ہو مگر یہ بلوچستان میں اردو ناول نگاری کے باب میں ایک قابل قدر اضافہ ضرور ہے۔

نوٹ: بعد میں آغا گل صاحب نے ایک نشست میں بالآخر اس راز سے پردہ اٹھا ہی لیا کہ ایسا ہی تھا، مگر بیوی، بڑے بچوں اور دیگر مجبوریوں کی وجہ سے اصل کینوی کے ساتھ شادی نہ ہو سکی۔ اور انھوں نے مجھے اصل کینوی کی تصویر بھی بھیجی، وہ یقینا بہت دل کش تھی۔

آغا گل کی شاعری پر ایک سرسری نظر

آغا گل نہ صرف افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں، بل کہ وہ ایک شاعر بھی ہیں۔'رہ حافظ وخیام' ان کا شعری مجموعہ ہے۔ گل تخلص استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے شاعری بہت کم کی ہے۔ جب میں نے ان سے اس بابت استفسار کیا تو کہنے لگے:"زندگی میں صرف بلوچستان اور اپنی محبوبہ (میں یہاں رازداری کے تحت نام لکھنا نہیں چاہتا) سے عشق کیا۔ بلوچستان مجھے Own نہیں کرتا اور محبوبہ نے کئی برس بعد ہاتھ چھڑا کر انسانوں کے جنگل میں کھو گئی۔ یوں پھر شاعری ترک کر دی"۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر بت پرست ہوتا تو اپنی محبوبہ کو بھگوان سمجھ کر عمر بھر اس کی پوجا کرتا۔ جس شخص کو عشق کے الزام سے عزت ملتی ہو اور محبوبہ کے نام سے پہچان، اس شخص کو حافظ وخیام کی راہ کی مٹھی بھر خاک کے سوا اور کیا چاہیے۔ یہی 'کچھ خاک رہ حافظ و خیام' آغا گل کا کل اثاثہ ہے۔

آغا گل کی نظر میں شاعر وقت کی پیداوار اور روح عصر کا تابع ہونے کے ساتھ ساتھ زمان و مکان سے ماورا بھی ہوتا ہے۔ شعر میں جغرافیے کی دانش اور تاریخ و ثقافت ضرور پوشیدہ ہونی چاہیے۔ ہر چند آغا گل کی شاعری کا چشمہ بلوچستان کی سرزمین اور ان کی محبوبہ کے وجود سے پھوٹا ہے۔ بلوچستان ان کا وطن ہے، ان کے خوابوں کی سرزمین ہے اور ان کی جائے نماز ہے۔ ان کا بلوچستان سرسبز وادیوں، اونچے اونچے کہساروں، حسین ریگ زاروں اور محبت بھرے انسانوں کی سرزمین ہے۔ وہ اپنے بلوچستان سے بے پناہ محبت کرتے ہیں، مگر ان کا بلوچستان اسیر ہے، پابہ زنجیر ہے اور آلام کی تصویر ہے۔

اے بلوچستان! اے میرے وطن میری زمین

اے میری چاہت کی دنیا، میرے خوابوں کی زمین

جی میں آتا ہے کہ ہر ہر گام پر سجدے کروں

تیری خاطر ہی جیوں، میں تیری خاطر ہی مروں

سیدھے سادھے لوگ، سچے، محنتی، ایماندار

جھوٹ، جبر و مکر سے نفرت سے رہا جن کا شعار

وہ اپنی شاعری میں بھی بلوچستان پر سرداری نظام کے آسیب کا رونا روتے ہیں۔ اور پوچھنا چاہتے ہیں کہ:

کر دیا کس نے مسلط ہم پہ سرداری نظام

قہر ہے، اپنوں نے اپنوں کو بنایا ہے غلام

گھر میں سرداروں کے اک جشن طرب ہے صبح و شام

پیٹ بھر دو وقت کھانے کو ترستے ہیں عوام

جب اپنے ہی بک جاتے ہیں تو اس کا علاج بھی اپنوں ہی سے ممکن ہے۔

کہہ دو سرداروں سے ان کو جلد ہی شہ مات ہے

"چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے"

ظلم کی آندھی کو روکیں جوہر ایمان سے

آؤ بھڑ جائیں دکھوں سے، درد کے طوفان سے

خون سے اپنے رقم کر دیں نئی اک داستاں

ہم ہی رکھوالے ہیں اس کے، ہم ہی اس کے پاسباں

ایک بار جب بلوچستانی نوجوانوں میں جذبہ حب الوطنی جڑ پکڑ لیتی ہے تو پھر اپنی سر زمین کو جنت بنائے بغیر آرام ان پر حرام ہوتا ہے۔

دور اس ارض و سما سے کیسے جاسکتے ہیں ہم

اپنی اس دنیا کو ہی جنت بنا سکتے ہیں ہم

ایک لودھی نوجوان براہوی عشق میں نیلے عنبر کی ان انتہاؤں تک پہنچتا ہے کہ واپسی پر پورے بلوچستان کے لیے تحفے میں اردو افسانہ نگاری کی برسات، اردو ناولوں کی رم جھم، براہوی تاریخ کی دھنک، اور اردو شاعری کی مہک کے سوا کچھ نہیں لاتا۔ ہوش آنے کے بعد جونہی وہ بے آب و گیاہ اور بے حس و بے مروت سر زمین پر اترتا ہے تو انھیں اپنی کم مائیگی کا شدید احساس ہوتا ہے، اور دوبارہ عالم جنون میں رہ حافظ و خیام کا ہم سفر ہو جاتا ہے۔

وہ اپنے افسانوں اور ناولوں کی طرح شاعری میں بھی براہوی کلچر اور بلوچستانی عوام کی تعریف و تحسین کرتے ہیں کہ انھوں نے انگریزوں سے آزادی حاصل کی، بلوچستان کو وقار دیا، دشمن کو شکست دی، باہمی اتفاق سے انسانی زندگی گزارنے کے قابل ہوگئے اور غلامی کا خاتمہ کیا۔ مزاحمت ان کی تمام تحریروں کی پہچان ہے۔

جفا و جبر کے یہ شعلے تم ہی تو بجھاؤ گے

ہر ایک ظلم و جور کی تمھی چتا جلاؤ گے

غلامی سے نجات اپنی قوم کو دلاؤ گے

فلک پہ رحم اور کرم کا ابر بن کے چھاؤ گے

براہویو بڑھے چلو، براہویو بڑھے چلو

آغا گل کی محبت بلوچستان کے گرد گھومتی ہے۔ ان کا جینا مرنا بلوچستان کی خاطر ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ بلوچستان پر امن اور ترقی یافتہ بن جائے۔

روح آزادی یہی ہے، قلب پاکستان ہے

تیرا میرا کیوں، یہ ہم سب کا بلوچستان ہے

وہ مستونگ کی سر زمین، کاریزات، فصلوں، وادیوں اور آب و ہوا کی منظوم تعریف اسی لیے کرتے ہیں کہ یہاں ان کا بچپن گزرا اور محبت کے اسرار و رموز سیکھے۔ مستونگ کی رومان پرور فضاؤں نے ان کو نہ صرف ایک حساس شاعر بنایا، بل کہ ایک بالغ النظر انسان بھی بنایا۔ محبتوں کے لیے ضروری نہیں کہ کامیاب ہو جائیں، بل کہ اکثر اوقات ناکام محبتیں کامیاب زندگی کے لیے پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ جہاں اپنی طفولت اور بلوغت کا عہد گزارتا ہے، پھر کہولت میں بھی ان کی یادوں (ناسٹلجیا) سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ اور ہاں یہ تجربہ صرف مردوں تک محدود نہیں ہے۔

ہائے وہ مستونگ کی رومان پرور سر زمین

ایسی دلکش اور حسین جس کا کوئی ثانی نہیں

اشکنہ !رنگین و دلکش داستانوں کی زمین

وہ مری دمساز اور بچپن کی یادوں کی امین

اشکنہ میں جو بھی گزرا وقت تھا وہ بے مثال

مجھ کو ہے جکڑے ہوئے اس کی حسین یادوں کا جال

دشت میں تنہا کھڑا میں ہاتھ ملتا رہ گیا

اشک اک ٹپکا کنار چشم سے اور بہہ گیا

وہ اپنی محبوبہ کی سراپا، جسامت، حسانت، نازک اندام، اداؤں، شرارتوں، آنکھوں اور زلفوں کا نہایت جذباتی مگر لطیف انداز میں ذکر کرتے ہیں۔ ان کو اپنی محبوبہ کا چاند ستارہ جسم، نیلا آکاش چہرہ اور گھنے بادل زلف سے ایک کائنات محبت ہے۔ مگر اس کائنات محبت کو عمر بھر دیکھنے سے بھی ان کا دل نہیں بھرتا۔

چاند سا جسم ستارا چہرہ

نیلے آکاش سا پیارا چہرہ

موج در موج سراپا آبی

وہ بدن جھیل، کنارا آنکھیں

عمر بھر دیکھوں مگر دل نہ بھرے

ایسا دلکش ہے تمھارا چہرہ

آغا گل کی شاعری میں اکثر محاسن شعری جیسے استعارات، تشبیہات اور محاکات موجود ہیں۔ ان کی شاعری پڑھتے ہوئے جانے کیوں مجھے فیض احمد فیض اور حبیب جالب یاد آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں کے پاس دو دو دل تھے "ایک حقیقت اور دوسرا رومان کے لیے۔ اور ان دونوں نے غزل اور نظم کو ایک دوسرے میں گڈمڈ نہیں کیا تھا۔ آغا گل بھی دو دلوں کا مالک نکلا— چھپا رستم! یہ تعلی پیش خدمت ہے:

اہل قلم کی صف میں نمایاں ہوں اس لیے

عکس جمال اس کا، مرے فکر و فن میں ہے

اگرچہ محبوب کی چاہت میں جان و من کے غارت ہونے کا قوی اندیشہ ہے، مگر اس کی روح کو لفظوں میں محفوظ کرنے سے عاشق اور معشوق دونوں کو طبعی زندگی سے زیادہ زندگی مل سکتی ہے۔

آغا گل تنہائیوں میں ہو یا بھری انجمن میں، محبوبہ کے حسین پیرہن کی خوشبو، تازہ گلاب جیسے رخسار و لب کی مٹھاس اور دل کی کلی کھلانے والے غنچہ دہن کی مہک ہمیشہ ان کے آس پاس رہتی ہے۔ محبوب کی یادیں ان کو آرام پہنچاتی ہیں اور اسی کے ذکر سے ان کے دل کا نگر آباد رہتا ہے۔ یہ پوری غزل گنگنالیں:

دل میں تیرا خیال رکھا ہے

دوستی کو بحال رکھا ہے

معجزہ ہے یہ تیری الفت کا

غم دوراں کو ٹال رکھا ہے

ابر ہے یا کہ چاند چہرے پر

زلف پیچاں کو ڈال رکھا ہے

عین ممکن تھا میں بہک جاتا

اس نے مجھ کو سنبھال رکھا ہے

جانے کیا دے جواب غنچہ دہن

دل میں جو اک سوال رکھا ہے

خواہش گل کہ آرزوئے وصال

ان میں دل کو بحال رکھا ہے

آغا گل کی تمام تر شاعری اس ایک غزل کا صدقہ ہو جائے!

تو چودھویں کا چاند تیری شان عالیہ

تو ہے دوائے درد دل و جان عالیہ

ہر صبح دھارتی ہے نسیم چمن کا روپ

کرتی ہے بوئے گل کو پریشان عالیہ

تو ہی اساوری ہے، باگیشیری بھی تو

ہے بھیروں کی ایک حسیں تان عالیہ

بدر منیر کی طرح تو ہے فلک نشیں

میں اک چکور کوہ بیابان عالیہ

سچی محبتوں میں دوئی کا ہے کیا سوال؟

میں جسم میں ہوں تو جان میری جان عالیہ

جوہر شناس میں ہوں تو وہ کوہ نور ہے

میں کوہ کن تو ہیرے کی اک کان عالیہ

ہے اس کی دید میرے لیے عید کی نوید

میرے ہر ایک درد کا درمان عالیہ

تعریف اس کی حد بیاں سے بھی ہے فزوں

ذی عتر و ذی و قار و ذی شان عالیہ

ہم ہیں بھکاری مانگتے ہیں حسن کی زکوات

اے شاہ حسن! دے ہمیں کچھ دان عالیہ

گنجائش اس میں اور کس کی بھلا کہاں!

ہے میرے دل کی ایک ہی مہمان عالیہ

جلوہ تیرا میں دیکھ کے سجدے میں گر پڑا

کمزور ہے بہت میرا ایمان عالیہ

میں بت پرست ہوتا تو کہتا یہ سب سے گل

میں پجاری اور میرا بھگوان عالیہ

آغا گل نے ثابت کر دیا کہ محبت لین دین، سودا اور کاروبار نہیں ہے، بل کہ یہ ایک یک طرفہ قربانی کا نام ہے۔ آغا گل نے براہوی کلچر اور بلوچستان کی سر زمین کو کیا نہیں دیا، مگر محبت کر کے آغا گل کو کیا ملا؟ شاید بہت کچھ، مگر محبت نہیں!!!

حضرت علیؑ کی پیشین گوئیاں

حضرت علیؓ مسلمانوں کے چوتھے خلیفہ تھے۔ ان کی دانش مندی، فہم و فراست اور دور اندیشی ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے اقوال، خطبات، مکاتیب، کلمات، نصائح، ارشادات اور پیشین گوئیوں کو چوتھی صدی ہجری کے آخر میں سید رضی نے نہج البلاغہ کے نام سے جمع کیا۔ نہج البلاغہ کے معنی ہیں: 'بلاغت کا راستہ'۔ مولا علی ہمیشہ کہا کرتے تھے: ''سلونی قبل ان تفقدونی"۔ یعنی جو پوچھنا چاہو، ہم سے پوچھ لو، اس سے پہلے کہ میں تمھارے درمیان نہ رہوں۔

مولا علی آغا گل کی پسندیدہ شخصیت اور نہج البلاغہ ان کی پسندیدہ کتاب ہے۔ "حضرت علیؑ کی پیشین گوئیاں" آغا گل کی ایک ایسی کتاب ہے جس میں انھوں نے مولا علی سے اپنی محبت کا حتی الوسع حق ادا کیا ہے۔ میری بدقسمتی دیکھیے کہ اب تک میں نے یہ کتاب نہیں پڑھی ہے اور نہ ہی اس کتاب کے موضوعات، اہمیت اور منصب سے آگاہ ہوں۔ زیر نظر تحریر آغا گل کی اسی کتاب کا نہایت ہی مختصر خلاصہ ہے۔

آغا گل کو دلی رنجش ہے کہ ملوکیت نے ہمیشہ سے نہج البلاغہ کو ترچھی نظر سے دیکھا ہے۔ 20ویں صدی میں مسلم دنیا کو مختلف ریاستوں میں تقسیم اور روس کا راستہ روکنے کے لیے امریکا اور برطانیہ نے ایک بڑی تعداد میں امریکا نواز اسلامی جماعتیں بنائیں۔ جس کے ذریعے امریکی اسلام پھیلا اور اس صدی کے آخر تک یہ نظام بہت مضبوط ہو گیا۔ اس پوری صدی میں بھی نہج البلاغہ کی سخت مخالفت جاری رہی۔ جسے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب میں ضرور کوئی نہ کوئی کائناتی سچ پوشیدہ ہے۔

دنیا میں فساد، جرائم اور اور انسانی اقدار کی پامالی تب سے شروع ہوئی جب سے زمین ملکیت کی چیز ٹھہری۔ ریاست کا نظریہ جبر یہاں سے شروع ہوا۔ ملوکیت نے ہمیشہ سرمایہ دارانہ نظام کو تقویت دی۔

اس ملوکیت میں بنوامیہ سے لے کر اب تک کی امریکی غلامی میں پلنے والی تمام نام نہاد اسلامی ریاستیں شامل ہیں۔ جن اسلامی ریاستوں نے سرمایہ دارانہ نظام سے رو گردانی کی ہے ان کا دھڑن تختہ ہو گیا ہے۔ آغا گل نے اپنی کتاب نہج البلاغہ میں شامل حضرت علیؑ کی ان تمام پیشین گوئیوں کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق جنگ جمل، جنگ صفین، جنگ نہروان، امیہ ملوکیت، عباسی

بادشاہت، زوال بصرہ، فتنہ زنگی، فتنہ قرامطہ اور دیگر اسلامی واقعات سے ہے۔ یہاں میں صرف چند پیشین گوئیوں کو زیب قرطاس کرتا ہوں۔

حضرت علیؑ کی پیش گوئی تھی کہ:

"آسمان میں شگاف پڑ جائے گا۔"

یعنی آسمان میں اوزون کی تہہ پھٹ جائے گی۔ جسے دنیا کو ناقابل تلافی نقصان ہو گا۔

ان سے پوچھا گیا کہ بچے جننے والے اور انڈے دینے والے جانداروں میں کیا فرق ہے؟ مولا علی کی ذہانت دیکھیے:

"جن جانداروں کے کان ظاہر ہیں وہ بچے جنتے ہیں، اور جن کے کان ظاہر نہیں ہیں وہ انڈے دیتے ہیں۔"

حضرت علیؑ نے اپنے مصاحب جناب میثم تمار، جناب قنبر اور حضرت کمیل کی شہادت کے بارے میں جس طرح پیش گوئی کی تھی، عینہ اس طرز پر ان کی شہادت واقع ہو گئی۔ عمرو بن سعد کے متعلق کہا تھا: "وہ جنت اور دوزخ میں سے دوزخ کو اپنائے گا۔" سو، عمرو بن سعد نے حضرت امام حسینؑ کے خلاف رے کا حکمران بن کر مقابلے کے لیے روانہ ہوا۔ انس نجفی (ایک منافق) سے کہا تھا: "تیرے گھر میں ایک بچھڑا ہے جو فرزند رسول ﷺ کو قتل کرے گا۔" بعد میں انس نجفی کا بیٹا سنان حضرت امام حسینؑ کا قاتل بنا۔

بنو امیہ کے حکمرانوں کے متعلق چند پیش گوئیاں ملاحظہ ہو:

"اللہ کی حرام کی ہوئی ایسی چیز نہ ہو گی جسے یہ حلال نہیں کریں گے۔"

"خدا کی قسم! میرے بعد بنی امیہ تمھارے لیے بدترین حاکم ثابت ہوں گے۔ اس بوڑھی اور لات مارنے والی سرکش اونٹنی کی طرح جو دودھ دوہنے والے کو کاٹ کھاتی ہے۔ اپنی اگلی ٹانگیں اس کے سر پر مارتی ہے اور پچھلی ٹانگوں سے دولتی جھاڑتی ہے اور اس طرح دودھ دوہنے میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔"

"میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اے بنی امیہ تم تھوڑے ہی عرصے میں جان لوگے کہ ریاست و دولتِ دنیا (تم سے) چھن کر دوسروں کے ہاتھوں میں چلی جائے گی اور (پھر وہاں سے نکل کر) تمھارے دشمنوں کے گھر میں منتقل ہو جائیگی۔"

فتنہ زنگیہ اور فتنہ قرامطہ کے متعلق دوراندیشی قابل ستائش ہے:

"اے لوگو! میرے بعد ایسے فتنے رونما ہوں گے جو شبِ تاریک کی ساعات کی طرح سیاہ ہوں گے۔ ان فتنوں کی روک تھام کے لیے نہ کوئی کھڑا ہو گا اور نہ کوئی پرچم ان فتنوں کو رد کر سکے گا۔"

کوفہ کے لٹنے اور تباہ و برباد کرنے کے متعلق پیش گوئی کی تھی:

"اے کوفہ! تیرا وہ منظر گویا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تجھے چرمِ عکاظی کی طرح کھینچا جا رہا ہے اور تجھے حوادث روزگار کے تخت و تاراج سے پامال کیا جا رہا ہے۔"

علمائے سو اور حفاظ کرام کے متعلق ایسی لب کشائی کی تھی کہ اب تک اسے کوئی نہیں جھٹلا سکا، اور یہ عصر حاضر کی سب سے بڑی سچ ہے:

"حاملانِ قرآن، قرآن کو بیچ دیں گے اور حافظانِ قرآن، قرآن کو بھلا دیں گے۔ قرآن کے نام کے سوا ان کے پاس کچھ نہ ہو گا۔ یہ اس کی خط و کتابت کے علاوہ کچھ نہ جان سکیں گے۔"

ان کی آخری پیش گوئی جو انھوں نے رمضان المبارک میں منبر پر بیٹھ کر کی تھی، وہ بھی پڑھ لیں۔

دائیں جانب کو حضرت امام حسنؑ سے پوچھنے لگا:"بیٹے!اس ماہ کے کتنے دن رہ گئے ہیں؟"

"تیرہ دن"۔ حضرت امام حسنؑ نے جواب دیا۔

پھر بائیں جانب حضرت امام حسینؑ کو دیکھ کر پوچھنے لگے:

"بیٹے!اس ماہ کے کتنے دن گزر گئے ہیں؟"

"سترہ دن"۔ حضرت امام حسینؑ نے جواب دیا۔

پھر اپنی ریش مبارک پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمانے لگے:

"اس ماہ میں میری داڑھی کو میرے سر کے خون سے وہ شخص خضاب کرے گا جو اس امت کا بدترین فرد ہو گا۔ قبیلہ مراد کا ایک نامرد میری موت کا خواہاں ہے، جب کہ میں اس کی بھلائی چاہتا ہوں۔"

پھر دوسرے روز 19 رمضان کو یمنی باشندے عبد الرحمن ابن ملجم مرادی نے امیر المومنینؑ کو مسجد کوفہ میں شہید کر دیا۔

آغا گل کی کتاب "حضرت علیؑ کی پیش گوئیاں" میں مولا علیؑ کی فہم و فراست، امیہ ملوکیت کے زوال کے اسباب اور بعد کی تاریخ بہت تفصیل سے موجود ہے۔

اس تحریر کے آخر میں یہ ذکر کروں کہ آغا گل حضرت علی، امام حسن اور امام حسین کے ساتھ ؑ/ؑ لگاتے ہیں، اور میں نے جہاں گنجائش تھی یا کتاب کے حوالوں References کو ٹھیس نہ پہنچتی، ان تینوں کے ساتھ ؑ/ؓ لگایا ہے۔ میں مذہبی مباحث کے ابجد سے قطعاً ناواقف ہوں، مگر اتنا جانتا ہوں کہ ان مباحث میں پڑے بغیر بھی زندگی گزاری جاسکتی ہے۔ دنیا بہت وسیع ہے۔

حاصل کلام

بلوچستان نہ صرف سیاسی، سماجی اور معاشی لحاظ سے ایک پس ماندہ صوبہ ہے، بل کہ ادبی اور فکری لحاظ سے بھی اس کا حال بد گفتنی نہیں۔ یہ خطہ ایک طویل عرصے سے آزادی، خود مختاری اور خوش حالی سے ناواقف رہا ہے۔ اس صوبے کے لیے اپنا جغرافیائی محل وقوع اور قیمتی ذخائر فرینکنسٹین بنے ہوئے ہیں۔ بلوچستان کی غربت اور پس ماندگی ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ یہاں کے باسی امن، تعلیم، صحت، روزگار، صاف پانی، انصاف، ذرائع ابلاغ اور جدید ذرائع رسل و رسائل سے محروم ہیں۔ یہاں روزانہ کی بنیاد پر عوام اپنے حقوق کے حصول کے لیے بر سر احتجاج رہتے ہیں، سڑکیں اور شاہراہیں بند رہتی ہیں، پہیہ جام ہڑتال روز کا معمول بن چکی ہیں اور طلبہ تنظیموں کی طرف سے مسلسل احتجاجوں کی وجہ سے تعلیم روبہ زوال ہوتی جارہی ہے۔ عوام فاقوں مر رہے ہیں، گھونٹ گھونٹ پانی کو ترس رہے ہیں، صبح کو گھر سے نکلے عوام کی شام کو واپسی کی کوئی ضمانت نہیں، چوری چکاریاں اور سرعام قتل وغارت عروج پر ہے، اکثریت پر اقلیت کی حکومت ہے، عوامی سیاسی رائے اپنی حیثیت کھو چکی ہے، میرٹ کی پامالی اور بدعنوانی فیشن بن چکی ہے اور رہی سہی کسر قدرتی آفات، زلزلوں، سیلابوں اور وباؤں نے پوری کر دی ہے۔

بلوچستان ایک ایسی لیبارٹری ہے جس میں میزائلوں، ٹینکوں اور بموں کے تجربات کے ساتھ ساتھ سیاسی شعبدہ بازیوں اور مذہبی معجونوں کی تیاری بھی کی جاتی ہے۔ دنیا میں قلم اور کاغذ کی خرید و فروخت ہوتی ہے، جب کہ بلوچستان میں قلم کاروں کی منڈیاں لگتی ہیں۔ دنیا میں کھوپڑیوں کی بخیہ گری ہوتی ہے، لیکن بلوچستان میں کھوپڑیوں کے بخیے اڑائے جاتے ہیں۔ اور دنیا میں ادیبوں کو ریاست کی آواز اور پہچان قرار دیا جاتا ہے، مگر یہاں ادیبوں کو آواز اور پہچان سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

ایسے حالات میں بلوچستان کا شفاف نظارہ صرف نقشوں میں ہی ممکن ہے، مگر اس کی اپنی کوئی سیاسی، سماجی اور ادبی پہچان نہیں ہے۔ آغا گل ایک عرصے سے اس تگ و دو میں ہیں کہ بلوچستان کو حد سے حد اردو افسانہ نگاری میں زندہ و جاوید رکھے۔ وہ بلوچستان کے نبض شناس ہیں۔ انھوں نے بلوچ بیلٹ کو 'پہاڑ اور محبت' اور پشتون بیلٹ کو 'چار گل' کے ذریعے متعارف کرا کے

یہ بتانے کی کوشش کی کہ یہاں سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ یہاں بھائی کو بھائی سے لڑایا جاتا ہے، یہاں کے وسائل کو تحفہ و تحائف کی شکل میں سپر پاورز میں بانٹے جاتے ہیں، یہاں کمیونزم اور کیپٹلزم کی کشتی لڑانے کے لیے کھیل کے میدان بنائے جاتے ہیں، یہاں نظریات کا کاروبار ہوتا ہے، یہاں تہذیبوں اور ثقافتوں کی بانجھ کاری کی جاتی ہے اور یہاں محب وطن کو غدار اور غداروں کو محب وطن سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کی تاریخ اور ادب سے کھلواڑ کیا گیا ہے اور حق کو باطل اور باطل کو حق کی ملمع کاری سے آلودہ کر دیا ہے۔

اس گھٹن زدہ صورت حال میں بلوچستان کی اصل تاریخ، حقائق، مسائل اور ان کا حل سمجھنے کے لیے آغا گل کے افسانے پڑھنا از حد لازمی ہے۔ ان کے افسانے اور ناول پڑھنے سے بلوچستانیوں میں خودی کا احساس، سچ کا ادراک، جینے کی تمنا، آواز بلند کرنے کی ہمت، مزاحمت کی جرات اور تبدیلی لانے کی روح پیدا ہوتی ہے۔ وہ فلسفہ نہیں جھاڑتے، تخیل بازی نہیں کرتے، پہیلیاں نہیں بناتے، معمے تخلیق نہیں کرتے اور مخمصوں میں بھی نہیں پڑتے، بل کہ آسان لفظوں میں بلوچستانیت پر مبنی فکر کو افسانوی ادب کے فنی سانچوں میں ڈال دیتے ہیں۔

وہ خالص بلوچستانی افسانہ نویس ہیں۔ ان کے افسانوں اور ناولوں میں کم و بیش بلوچستان کے تمام اضلاع، شہروں، شاہراہوں، ریلوے اسٹیشنوں، پوسٹ آفسوں، سیاحتی و تاریخی مقامات، مشہور ہوٹلوں، تعلیمی اداروں، انتظامی و آئینی سربراہوں، سیاسی پارٹیوں اور ادیبوں کے نام تفصیل سے موجود ہیں۔ بلوچستان کی سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی اور تہذیبی مزاج شناسی کے لیے ان کی تحریریں سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔

آغا گل سادہ مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ سخت مزاج بھی ہیں۔ اپنے موقف سے ذرا بھی ہٹنا گوارا نہیں کرتے۔ تاہم دلائل سننے کی بھرپور سکت رکھتے ہیں۔ عمر کے اس حصے میں بھی بلا کی قوت حافظہ اور قوت برداشت رکھتے ہیں، اور جمالیات پر مقصدیات نے غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ ان کی ہر بات انسانی حسن سے شروع ہو کر بلوچستان کی سوچی سمجھی بدصورتی پر ختم ہو جاتی ہے۔ میں نے آج تک کسی سیاست دان، بیوروکریٹ، ملا، صحافی اور ادیب کے ہاں بلوچستان کا دکھ اتنی شدت سے

نہیں دیکھا جتنا میں نے آغا گل کے ہاں دیکھا۔اس دکھ نے ان کو اب تک کوئٹہ شہر کے کئی مشہور سائیکاٹرسٹوں تک پہنچایا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ تکتو، چلتن، خلیفت، میاں غنڈی اور زرغون پہاڑ ان سے باتیں کرتے ہیں۔بلوچستان کے میدان اور صحراان کو آغوش میں لینے آتے ہیں،اور بلوچستان کے دریائے بولان، دشت، حب، ناڑی، ہنگول، کیچ اور باسول ہمیشہ ان کی آنکھوں سے پانی ادھار لینے آتے ہیں۔ڈاکٹروں نے انھیں نارمل مگر HYPER SENSITIVE قرار دیا ہے۔اس حساسیت میں کمی لانے کے لیے وہ روزانہ کی بنیاد پر مختلف ادویات کا سہارا لیتا ہے۔مجھے خدشہ ہے اگر یہ حساسیت کم ہوتی ہے تو بھلا وہ افسانہ کیسے لکھے گا؟ تاہم معروف ایڈیٹر شاداب کنول فیراز نے اس کیفیت کو عرفان ذات کا مرحلہ کہا ہے۔

ان کی تحریروں سے بعض اوقات قاری کو اکتاہٹ محسوس ہوتی ہے، کیوں کہ وہ عیاری، مکاری اور قلم فروشی سے اپنے فن کی ملمع کاری نہیں کرتے۔وہ اپنے قاری کو خوش فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا نہیں کرتے،بل کہ جیسا ہے کو ویسا ہی پیش کر دیتے ہیں۔ان کو کسی سے داد یا صلے کی تمنا بھی نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ سیکڑوں افسانے لکھنے اور دو درجن سے زیادہ کتب تصنیف کرنے کے باوجود وہ گم نامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔بلوچستان میں گم نامی پھر بھی غنیمت ہے، گم شدگی سے کوئی خدا بچالے!

فرہنگ

آغا گل کی اپنی کوئی مادری زبان ضرور ہو گی، مگر اس کے باوجود انھوں نے اردو زبان میں ادب کی تخلیق کی ہے۔ شاید ان کی نظر میں اردو وہ واحد زبان تھی جس میں صوبائی سطح پر بھی بلوچستان اور بلوچستانیوں کو متحد رکھنے کی روح موجود تھی۔ یوں تو معاشی اور سیاسی لحاظ سے مستحکم بڑی قوتیں اپنے قومی اور سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتی ہیں کہ کمزور اقوام کے مختلف علاقوں کے درمیان ایک ایسی مرکزی زبان جو انھیں ایک متحد قوم بناتی ہے، کو پنپنے سے روک دیں۔

قوموں کے عروج وزوال میں مرکزی زبان کا بہت بڑا کردار ہوتا ہے۔ اگر امریکا، روس، چین، جاپان، فرانس، برطانیہ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک سے ان کی مرکزی زبانوں (انگریزی، روسی، چینی، جاپانی، فرانسیسی) کو نکال دیا جائے اور ان ملکوں میں ان کی مرکزی زبانوں کے بجائے مختلف مقامی زبانوں کا سہارا لیا جائے تو ان کی قومی یک جہتی، معاشی ترقی، سیاسی اثر رسوخ، تاریخ، ادب اور دیگر تہذیبی و ثقافتی حقائق انتشار اور تنزل کا شکار ہو جائیں گے۔ پاکستان بالعموم اور بلوچستان بالخصوص شاید اسی المیے سے دوچار ہیں۔

پاکستان میں مرکزی زبان (اردو) ہر گزرتے دن کے ساتھ کمزور تر، جب کہ علاقائی زبانیں مضبوط تر ہوتی جا رہی ہیں، جو بعد میں ممکنہ طور پر مزید جغرافیائی تقسیم کا باعث بن سکتی ہیں۔ اس مبحث سے غایت علاقائی زبان و ادب کی حوصلہ شکنی نہیں، بل کہ علاقائی زبانوں کی اردو سے لسانی چشمک کی طرف اشارہ ہے، جو بہت مایوس کن ہے۔

آغا گل کے اسلوب کی بنیادی پہچان ان کے اپنے اردو افسانوں میں براہوی، بلوچی، پشتو اور انگریزی، سنسکرت اور لاطینی الفاظ کا تواتر سے استعمال ہے۔ انھوں نے اردو زبان کو وسعت، تازہ خون اور نئی زندگی دینے کے لیے نیا ذخیرہ الفاظ، تراکیب، استعارے اور علامتیں استعمال کی ہیں۔ کلاسیکل اثر و رسوخ کی وجہ سے انھوں نے اساطیری حوالوں کا سہارا بھی لیا ہے۔ ایک Unique blend of languages ان کی پہچان بن گئی ہے۔ جیسا کہ آغاز میں ذکر کیا گیا ہے کہ وہ لسانی تطہیر کے خلاف تھے۔ انھوں نے نہ صرف فکری و فنی لحاظ سے بھی بلوچستان کی نمائندگی کی ہے، بل کہ لسانی لحاظ سے بھی بلوچستان کا حق ادا کیا

ہے۔ اردو زبان میں دیگر زبانوں کے الفاظ کا دخول جائز ہے یا نہیں—یہ ایک الگ علمی وادبی موضوع ہے۔ میرے نزدیک اگر کسی تحریر کا فکری مزاج ایک خاص تہذیب و تمدن، جغرافیہ اور کلچر سے متعلق ہو تو اس تحریر میں اسی حساب سے مقامی زبانوں یا بولیوں کے الفاظ کا محدود ادخال جائز ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اردو میں مقامی زبانوں اور بولیوں کے الفاظ کی قبولیت کی نہ صرف کافی سکت ہے، بل کہ اردو کی جنم بھومی کی وجہ، ترقی کا جواز اور بقا کا راز بھی اسی وسعت نظری اور فراخ دامنی میں مضمر ہے۔ اردو میں دوسری زبانوں سے آنے والے الفاظ صرف 'اسماء' ہیں، جب کہ افعال اور حروف سارے مقامی ہیں۔ اگر آغا گل کی اردو میں بلوچستانی اسماء کا دخل ہے تو یہ انہونی بات نہیں۔ عموماً زبان اور اس کے لہجے میں مقام بہ مقام اور عہد بہ عہد تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں جو آہستہ آہستہ قبولِ عام حاصل کرنے کے بعد جزوِ زبان بن جاتی ہیں۔

اردو زبان میں لسانی تجربوں کی روایت بہت پرانی ہے۔ میر امن نے باغ و بہار اور منشی پریم چند نے اپنے افسانوں میں مقامی الفاظ کا استعمال بڑے پیمانے پر کیا ہے۔ میر امن نے باغ و بہار کے اکثر محاورے، افعال اور اسما دہلی میں بولی جانے والی زبانوں اور بولیوں سے مستعار لیے ہیں۔ باغ و بہار کی وجہ شہرت بھی یہی ٹھہری کہ انھوں نے قصہ چار درویش کو آسان مقامی زبان (اردو کی ابتدائی صورت) میں لکھا ہے۔ اسی طرح منشی پریم چند کے افسانوں کی مقبولیت کی وجہ ان کی فکری بلندی کے ساتھ ساتھ ان کی زبان میں مقامی الفاظ کا بہ کثرت استعمال بھی ہے۔ پریم چند نے اردو زبان میں معمولی صوتی، صورتی اور سیرتی انحرافات کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اس نوع کے تجربے اردو زبان کے لیے نہ صرف صحت مند ہیں، بل کہ اعلیٰ تخلیق کی راہ میں رکاوٹ بھی نہیں ہیں۔ پریم چند نے اپنے افسانوں میں حضور کے لیے ہجور، حق ناحق کے لیے ہک ناہک، خالی کے لیے کھالی، بیوفائی کے لیے بیوپھائی، زندگی کے لیے جندگی، خطا کے لیے کھتا، اوقات کے لیے اوکات، مزدور کے لیے مجور وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ آغا گل نے بھی بلوچستان اور خاص کر کوئٹہ کے مخلوط لسانی مزاج کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے افسانوں کی تخلیق کی ہے، مجموعی طور پر آغا گل نے اردو کے بنیادی ڈھانچے کو زک نہیں پہنچایا ہے، قواعد کے اصولوں پر یلغار نہیں کیا ہے اور نہ ہی اردو کی لسانی حرمت کو چیلنج کیا ہے، البتہ اردو ادب پر گرامر کی حکمرانی سے نجات حاصل کر لی ہے۔ عموماً نقادوں نے لسانی تجزیے کی دھند میں فکری تجزیے کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ حد سے حد اس شکایت کا جواز ہے کہ

انھوں نے اس قسم کے لسانی تجربے کر کے خود کو زیادہ سے زیادہ بلوچستان اور کم سے کم کوئٹہ شہر و مضافات تک محدود کر لیا ہے۔ تاہم آغا گل کے فن پر فکر اور زبان پر موضوع اتنا بھاری ہے کہ ان نکات کی جانب دھیان ہی نہیں جاتا۔ آغا گل کی گم نامی ان کی زبان اور اسلوب سے زیادہ ان کی حق گوئی کی وجہ سے ہے۔ حالاں کہ اسلوبیات طریقہ کار ہے، تنقید نہیں، لسانی امتیازات کی نشان دہی ہے، جمالیاتی قدر شناسی نہیں اور اسلوبیات ادبی تنقید کا معاون ہے، مگر اس کا بدل نہیں۔ آغا گل کے لسانی تجربے صرف اسلوب کا موضوع ہے جس میں زبان کے تخلیقی استعمال سے بحث کی جاتی ہے، نہ کہ تخلیقی ادب کے اعلیٰ اور ادنیٰ محاکمہ کرنے سے ---یہ ادبی تنقید کا موضوع ہے۔ یہاں مشکل یہ آن پڑی ہے کہ اسلوب کو تنقید کا بدل قرار دے کر زبان کی وجہ سے فکر کو مسترد کیا گیا ہے، جو ناقابل تلافی نقصان ہے۔ آغا گل نے زبانوں کی محدود حدود اربعہ کو منہدم کیا ہے۔ انھوں نے مروجہ دبستان دہلی اور لکھنو کا اتباع کرنے کے بجائے خود ڈکشن بن کر کوئٹہ کی اردو برتی ہے، کیوں کہ وہ اردو کو پاکستانی قالب میں ڈھال کر بلوچستان کی مٹی کی خوشبو کو اردو افسانے میں شامل کرنا چاہتا ہے۔ مستقبل میں اگر کہیں 'کوئٹہ کا دبستان اردو' کی عمارت تخلیق ہو گی تو اس کی بنیادوں میں آغا گل کی ست رنگی اردو ضرور ہو گی۔ کیوں کہ بلوچستان میں زبان سے زیادہ بولنے والے معدومیت سے دوچار ہیں اور اردو کے ساتھ مقامی زبانوں کی لسانی چشمک بھی عروج پر ہے۔ اس تناظر میں بلوچستان میں اردو کی بقا کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کی ست رنگی اردو کا نہ صرف جواز بنتا ہے، بل کہ لائقِ تحسین بھی ہے۔ ان کی زبان کے لسانی ڈھانچے سے بلوچستانی اردو کی ثقافتی گرامر بھی اخذ کی جا سکتی ہے۔ فیض احمد نے اس بحث کے متعلق اپنے مضمون 'جہان نو' میں کچھ یوں وضاحت کی ہے" :ہماری ادبی زبان یعنی اردو ہمارے ملک کے کسی حصہ میں بھی روز مرّہ بولی کی حیثیت سے رائج نہیں۔ ہمارے بیشتر ادیبوں نے اردو میں نہ کسی بچے کو روٹھتے ہوئے سنا ہے نہ کسی ماں کو لوری دیتے ہوئے۔ انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ روز مرہ زندگی میں دو مرد لڑتے ہیں تو کیا گالی بکتے ہیں اور دو مرد و عورت ملتے ہیں تو پیار کے کیا محاورے استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے کا جہان نو جبھی تعمیر ہو سکتا ہے کہ ہمارے ادیبوں کی موجودہ کتابی زبان عوام کی منہ بولتی ہوئی زبان میں بدل جائے۔ یہ کب اور کیونکر ہو گا۔ ہم نہیں کہہ سکتے۔ ممکن ہے اردوئے معلّٰی

اور مقامی بولیوں کے اختلاط سے ایک نئی زبان پیدا ہو۔ ممکن ہے اردو ہی ہمارے شہر اور دیہات کی زبان بن جائے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ نئے ادب کا جہان نوانھی مقامی بولیوں کے اینٹ گارے سے تعمیر کیا جائے۔"

اور ہاں بلوچستان میں افسانے کے فن نے اتنی ترقی بھی نہیں کی ہے کہ آغا گل کے فن کا یک سر استرداد کیا جائے، مگر محاکے اور درجہ بندی میں نشیب و فراز کا امکان ہمیشہ رہتا ہے۔

یہاں آغا گل کے افسانوں میں ان کی اپنی ترتیب کردہ فرہنگ کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

آ

آبادی ہونا: خوب سرسبز ہونا، فصل کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

آتام: روٹی کا ٹکڑا، طعام

آسرامار: کچھ ہتھیانے کے لیے رابطہ رکھنا

آماچ: مستونگ کا پہاڑ

آموختہ: عادی

آسرا تاوان ہے: اگر فوری اقدام کے متقاضی کام میں لیت و لعل اور تاخیر کی جائے تو نقصان کا خدشہ ہے۔

اتنڑ: جنگی مشقوں کی ترقی یافتہ صورت کا مردانہ رقص۔ عورتیں بھی اتنڑ کرتی ہیں۔

اجڑ: مویشیوں کا گلہ

اڑی کرنا: بہانہ کرنا

اڑی کڑی کرنا: ٹال مٹول سے کام لینا، کٹ حجتی کرنا، کسی کام کو انجام نہ دینے کے لیے حیلہ بہانہ کرنا

اڑے: کلمہ استعجابیہ، ہم عمر کو مخاطب کرنا

امارا: ہمارا

امپان: چمڑے کا مشک ایک من آٹے کا

انڈیوال / ہانڈیوال: دوست، ساتھی

اوتاخ: بیٹھک

اومان: قدرتی بوٹی جسے ایفیڈرین بنتی ہے۔

ب

بابل: باب اور ایل سے بنا ہے۔ باب سے مراد دروازہ اور ایل سے مراد خدا؛ یعنی خدا کا دروازہ

بارہ پتھر بار: سمجھ سے بالاتر

باڑی: خانے بنا کر لڑکوں کا کھیل

باہر والا: ہوٹل کے باہر دکانوں، کاروں وغیرہ میں چائے لے جانے والا ویٹر

باھوٹ: قاتل کا مقتول کے گھر پناہ گزین ہونا

باید: لازماً، ضرور

بارکھان: بارگاہ یا بارگان، جس کے معنی ہیں حاضری دینے کی جگہ۔ کثرت استعمال سے بارکھان بن گیا ہے۔

بجار: شادی بیاہ کے مواقع پر رواجاً دی جانے والی رضاکارانہ امدادی رقم

بچہ خوش: افلاطونی محبت کرنے والا

بچھو کا زہر: بے انتہا نشہ کرنے والوں پر جب عام نشہ آور اشیا بے اثر ہو جاتی ہیں تو دہکتے ہوئے کوئلوں پر بچھو رکھ کر اس دھوئیں کو اسٹرا سے سگریٹ کی طرح پیتے ہیں

بڑے کا گوشت کھانا: دوستی مین ہندو گائے کا گوشت بھی کھاتا ہے

بکری گم کرنا: پریشان اور بدحواس ہونا

بلا مانگنا: غرض رکھنا

بمبو کرنا: سخت پٹائی کرنا، زک پہنچانا

بندی خانہ: جیل، قید خانہ

بولڈ ال: بڑے دل والا، بے خوف و بے پرواہ شخص

بندغ: انسان، بندہ

بھنڈار کرنا: گپ شپ لگانا، مجلس کا گرم ہونا

بیخ نکل جانا: نقصان پہنچانا

بیحنی: بہت زیادہ، سب، تمام تر

بے غم ہو جانا: بے فکر ہو جانا

بے غیرت: سب اسٹینڈرڈ، غیر معیاری

پ

پاٹ باز: ڈراماباز

پاٹیں کرنا: حقیقت کو چھپانے کی کوشش کرنا، اداکاری کرنا

پاؤلی: سکہ،

پٹو: رومال

پٹوڈالنا: چہرہ چھپا کر جھانسہ دینا

پڑکامارنا: بڑا بول بولنا، ڈینگیں مارنا

پشین: ساسانی بادشاہ افراسیاب نے اپنے بیٹے پشنگ کے نام پر یہ شہر بسایا تھا، پھر بہ کثرت استعمال پشین بن گیا۔

پک: گندم کا بھوسہ

پیماز: پیاز

پینٹ مارنا: گھونسامارنا

پور: بدلہ

پوو: کیڑے مکوڑے

پوسکنگ خنک: نئی آنکھیں

پوغٹ: مینڈک

پیغور: طعنہ

پیون خنی: سفید آنکھوں والا / بے مروت

پھیٹ دینا: لعنت ملامت، پاتھ کے پنجے سے لعنت کا اشارہ دینا

ت

تختہ کرنا: شکست دینا، مغلوب کرنا، زیر کرنا، سبق دینا

تھانہ روڈ: کوئٹہ کا بازار حسن

تربور: کزن

ترتیزک: سلاد کی ایک قسم

تریالئی: شیر جیسے بہادر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

تکتو: کوئٹہ کے شمال میں دو چوٹیاں / پہاڑ / مجازاً چھاتیاں

تنگئی: وادی

ٹ

ٹائٹ پکڑنا: مضبوط پکڑنا

ٹکر ٹکر: تباہ حال، مفلس، شکستہ دل

ٹیلو: بچوں کا کھیل، جس میں ایک دوسرے کو پکڑنے کے لیے میلوں بھاگتے ہیں۔

ٹیم پاس: وقت گزاری

ج

جان کو پکڑنا: اپنے آپ کو تیس مار خان سمجھنا

جالاوان: زیریں بلوچستان

جٹ: ساتھی، ہم پیالہ، ہم نوا

جگاڑ کرنا: کسی غیر قانونی طریقے کوئی کام نکالنا

جنجال: پریشانی، مصیبت

چ

چپر کرنا: چھپا دینا، غائب کر دینا

چپیٹ: تھپڑ، طمانچہ

چٹک چٹک: جلدی جلدی

چرخ: لگڑ بگڑ، جسے گھیر گھار کر غاروں سے پکڑ کر کتوں سے لڑایا جاتا ہے، برسوں سے یہ کوئٹہ کی تفریح ہے

چرتی: گہری سوچ میں ڈوبا، اپنے آپ میں مگن

چرت خراب کرنا: پریشان کرنا، مشغولیت میں خلل ڈالنا، رنگ میں بھنگ ڈالنا

چمنی: باغیچہ

چم کش: آنکھیں نکلوانے والا، نادر شاہ افشار۔ مجازاً ظالم

چلتن بابا: کوئٹہ کا ایک لوک کردار۔ انگریزنے ان کے مزار کے نام سے چلتن توڑ، چلتن میں منسوب کیا۔ 1984 میں قبر کشائی کے بعد خفیہ طور پر جسد خاکی کچھ روڈ میں دفن کیا گیا، کیوں کہ چلتن بابا کینٹ انٹری پاس سے محروم تھے۔

چلہ کھوٹی: کسی گھر میں جسم فروشی کا اڈا

چنگوش تول: زندہ مینڈکوں کو ترازو میں تولنا

چووٹ: جوتا/جوتی

چھوٹا ہونا: بچپن سے ایک ساتھ کھیل کود کر بڑا ہونا۔ ایک ساتھ پرورش ہونا

چیدغ: کسی اہم واقعے پہ بطور یادگار پتھروں کا ڈھیر کرنا

چائی نک: کیتلی، وہ برتن جس میں چائے بنائی جاتی ہے۔

ح

حق وناحق: خوامخوا، بلاوجہ

حقل دما: Akeldama، خون کا کھیت

خ

خاٹول: گل لالہ

خاربازی: مقابلہ بازی

خاندانی آدمی: معزز آدمی

خانہ خرّوس: کلمہ تحقیر

خٹ کلہ: بڑی پگڑی والا۔ مجازاً ان پڑھ دیہاتی

خر: گدھا، بے وقوف

خرتاوانی: ناقابل تلافی نقصان پہنچانے والا، باعث زیاں

خرزو/خرژو: گدھے کا بیٹا۔ گالی بھی ہے اور بے عقل کے لیے بھی مستعمل ہے۔

خراباتی: شاہ خرش، فضول خرچ آدمی

خرابات کرنا: فضول خرچی کرنا

خرلیونی: پاگل، احمق

خرناٹ: زبردست

خر ینگڑی: حقل، تمہ

ختم: ناکارہ

خشت ڑہ: بے وقعت

خردہ: میت کی قبر کی کنکریاں، جو ضعیف الاعتقاد لوگ شفا اور دیگر اغراض کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

خرناٹ: زبردست

خروار: ایک خر کا بوجھ، چار بوریاں۔ مجازاً بہت ہی زیادہ

خلیحا: چیتا

د

دالبندین: دالبندین کو پہلے نعل بندین کہا جاتا تھا۔ چونکہ سفر میں نعل بدلنے کی ضرورت پڑی ہے، اور یہاں نعل بدلنے کا اہتمام ہوتا تھا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ گھاس پانی کے سبب جسے شہر دل بند یعنی پسندیدہ کہا جاتا تھا، دالبندین ہوا۔

دخل: کاؤنٹر

دست لافی: دکان داری کے آغاز میں پہلے گاہک سے جو آمدن ہو۔ بوہنی

داش: تندور

داشتی کا گدھا: جو ایک بار ایندھن لانے کے علاوہ ہمہ وقت بے کار کھڑا رہتا ہے۔ مجازاً ہڈ حرام انسان

دمنی ہوا: خزان کی سرد ہوا

دال میں انڈا دینا: تمھاری گھٹیا دال میں انڈا ڈال کر اس کا رتبہ بڑھا سکتا ہوں

درپدر: پریشان حال، بوکھلایا ہوا

درک نہ ہونا: پتہ نہ ہونا، معلوم نہ ہونا

درگئی: دیوی کی درگاہ / علاقے کا نام

دستی دستی: ہاتھوں ہاتھ، فوراً

دوزان: درہ بولان کا ایک مقام، جہاں تیز ہوائیں چلتی رہتی ہیں۔

ڈ

ڈباڈب: گتھم گتھا

ڈبل ڈبل: بھاگ دوڑ کرنا، دوڑ دوڑ کر کسی عمل کو دہرانا

ڈنڈامار: جھگڑالو

ر

رامت اللہ: رحمت اللہ

رش کش: ہجوم، بھیڑ

روٹی کرنا: دعوت کرنا

روزہ پکڑنا: روزہ رکھنا

ریکوڈک: ریگ سے مرد ریت اور ڈیک سے مراد ٹیلہ۔ ریت کا ٹیلہ

ز

زبان ماری: زبان درازی

زرندہ: پن چکی، زیارت کا قصبہ

زور آور: طاقت ور

زور کو سلام ہے: طاقت ور کی اطاعت لازم ہے

زور ہونا: برتر ہونا

زوڑ کافر: پرانا گناہ گار، جس کی اصلاح ممکن نہ ہو

زوئے / ژوئے: بیٹا۔ مجازاً کم عمر اور نا سمجھ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

زیرہ راوڑی خیر اوسی: مسجد / مدرسے کی روٹی لاؤ اور خیر کماؤ

س

ساب: صاحب

ساراوان: بالائی بلوچستان

سپت سندھو: سات دریاؤں کی سرزمین۔ ہندستان کا قدیم نام

سپین ژری: سفید ریش

سٹی سودا: حساب لگائے بغیر اندازے سے سودا طے کرنا

سر برابر ہونا: طبیعت بحال ہونا، خوش گوار موڈ میں ہونا

سرکک: کچھوا

سرہ غنڈی: سرخ چوٹی

سنگ: محصول، ٹیکس

سنگر: پتھر کا مورچہ

سلامالیکی: تعلقات، سوشل انٹرکشن

سوختہ ہونا: مشتعل ہونا، غصہ ہونا

سوراب: ثور آب

سیال: کزن

ش

شاٹ ہو جانا: غائب ہو جانا

شال کوٹ: کوئٹہ کا قدیم نام۔

شالو بالو: اترانا، اٹھلانا، بن سنور کے ناز و نخرے کرنا

شف شف کرنا: اصل موضوع سے ہٹ کر ادھر ادھر کی باتیں کرنا

شقوق: سیاہ و سفید جنگلی پرندہ، جو بآسانی پالتو ہو جاتا ہے۔

شلومے: لسی

شلی: بیس سیر گندم کا توڑا

شوٹ شوٹ: جلدی جلدی، عجلت میں

شیلہ / شیلے: وادی / وادیاں۔ پانی کی گزر گاہ، آب جو

ص

صبح مردان: علی الصبح

ط

طبیعت بند ہونا: موڈ ٹھیک نہ ہونا، کسل مندی

ظ

ظالم: بہت اچھا، بہت خوب صورت۔ جیسے فلاں ظالم شاعر ہے، فلاں خاتون ظالم ہے، یعنی دلربا ہے، فلاں ملا ظالم ہے، یعنی بہت قابل ہے۔ کافر بھی اسی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

غ

غٹ غٹ مارنا: شیخی بگھارنا، بڑا بول بولنا

غرق ترق: خیالوں میں ڈوبا ہوا

غواثکی / غوثکی: محفوظ و مامون علاقہ / زیارت کا پرانا نام

غوڑ: بہت خوب صورت لڑکے کو کہتے ہیں۔ غوڑہ، خوب صورت لڑکی کے لیے مستعل ہے۔

ف

فلانا فلانا: فلاں فلاں کو

ق

قاب سناوٹیں: بے نقط سنانا

قاشم: ندیوں کے کناروں پہ اگنے والے خودرو سرکنڈے

قندھاری ہوا: سخت سرد ہوا، گورییچ

ک

کابلی گاڑی: ٹیکس کی ادائی کے بغیر ملک میں داخل ہونے والی کار، جو غیر استعمال شدہ اور ارزان ہوتی ہے۔

کبر کرنا: غرور کرنا، تکبر کرنا

کٹ کٹ دیکھنا: غصے یا حسد سے دیکھنا

کٹاس نکالنا: بھر کس نکالنا، خوب مرمت کرنا

کروت / کورت: پنیر۔ عقل سے پیدل کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

کلٹی کرنا: الٹا دینا، مفعول بنانا، زیر کرنا

کماش: فساد کی جڑ، سرغنہ

کوٹہ: قلعہ۔

کوچرائی: شرمندگی، بے ہودگی

کولاچی: موجودہ کراچی کا قدیم شہر۔ مچھیروں کی بستی

کوڑک: کوڑ۔ ٹیڑھا

کوہلو: کوہ لو، یعنی پہاڑوں کی جانب۔ مریوں کا ایک اہم شہر

کھٹارا: کباڑا۔ پرانا

کھلی: پانی کا چھوٹا مشکیزہ

کھوکھا: ڈھابہ

کھڈہ غلام: ناہموار میدان، ہم جنس پرستوں کا پسندیدہ علاقہ

گ

گناخانہ: جہاں چرس، شراب، بھنگ اور کالین دین ہوتا دیگر نشہ آور اشیا ہے۔

گڈوڈ: ملا جلا، گھلا ملا، مکس ہونا

گریزر: سمگلنگ کرنے والا

گڑانگ: ویرانہ

گلوزور: سبی کا ایک سرد غار

گندخ کرنا: نومولود کو کپڑے میں لپیٹ کر باندھنا

گنوک: دیوانہ، پاگل

گوادر: گوات در یعنی نسیم بحری کا دروازہ۔

گواڑخ: صحرائی گل لالہ / خاٹول

گوانگو: رات میں نام لے کر پکارتا ہے کہ فلاں میں تمھارے لیے قیمتی تحفہ لایا ہوں، جو کوئی جواب دے فوراً ہی زبان بند ہو جاتی ہے۔ گونگا ہو جاتا ہے۔

گودڑا: ناکارہ، نالائق

گوریچ: یخ بستہ، ٹنڈرا کے میدانوں سے آنے والی ہوا

گولی مارنا: نظر انداز کرنا، درخور اعتنانہ سمجھنا

گھوڑا بابا کا غار: ایک مزار کے پہلو میں زیر زمین اڈا

گیدان: خیمے

گیژو: سفید جھوٹ بولنے والا

ل

لاندھی: خشک گوشت

لچر: بیہودہ، غیر اخلاقی

لغڑی: لفظی مطلب برہنہ حال، مجازاً آوارہ گرد، غنڈہ ٹائپ، چھوٹی موٹی سمگلنگ کرنے والا

لفڑا ہونا: جھگڑا ہونا

لک پاس: لک بمعنی درہ، پاس pass گزرنا

لنگڑی: فلاش میں دو تین پانچ کا طاقتور راؤنڈ

لنگ ولاش: بے سروسامان

لوڑ: بگولہ

لوگیں: لوگ کی جمع، بہت سے افراد

م

مادلی: محمد علی

مارخر: سانپ جیسے سینگوں والا / پہاڑی دنبہ / مارخور کو کہتے ہیں۔

ماز/مازی: یوں ہی

مالوم: معلوم

مجلسی آدمی: خوش مزاج اور گفتگو میں ماہر آدمی جسے قبول عام ہو

مچھ: کھجور کا درخت

مخامخ بولنا: منہ پر بات کرنا، آمنے سامنے بولنا، دلیرانی اظہار خیال کرنا

مررو: خرگوش

مری: مر سے مراد کلہاڑی ہے۔ مری سے مراد کلہاڑیوں سے لڑنے والے جنگجو لوگ

مستونگ: مسہ اور ٹنگ سے مل کر بنا ہے۔ مسہ بمعنی تین اور ٹنگ بمعنی راستے

مسیت ناں پاٹ: مسجد کی لکڑی

ملنگ ہوٹل: کوئٹہ کا ایک ہوٹل جو ملنگوں اور فقیروں کو مفت کھانا دیتا ہے، مفت کا کھانا

موالی: بے عقل، بے وقوف

میر اوس ہوتا: میرا اختیار ہوتا

میڑھ: صلح کے لیے بلوچی رسم

ن

نازوان: ناجوان، بے ہمت

ناژوائی: بے ہمتی، بزدلی

نوشکی: نوش سے مراد پینا اور کاہ سے مراد گھاس، بعد میں بگڑ کر نوشکی بنا

نوکنڈی: نوکیں سے مراد 9 ہے، اور کنڈی سے مراد راستے؛ یعنی نو راستے

نیفا/نیفہ: ازار بند/ناڑا

و

وختی: جلدی، بروقت

وڈھ: چھوٹا پہاڑ/پہاڑی

ولور: جہیز

ہ

ہڑدڑ: ہنگامہ

ہڑادوڑی: ہنگامہ، افراتفری

ہلبو خلبو: پکڑو مارو

ھلی: گھوڑا

ی

یاکولاچی کن: گوادر کی ایک خاتون کے نام سے معنون ہے

ختم شد

آغا گل کی چند یادگار تصاویر
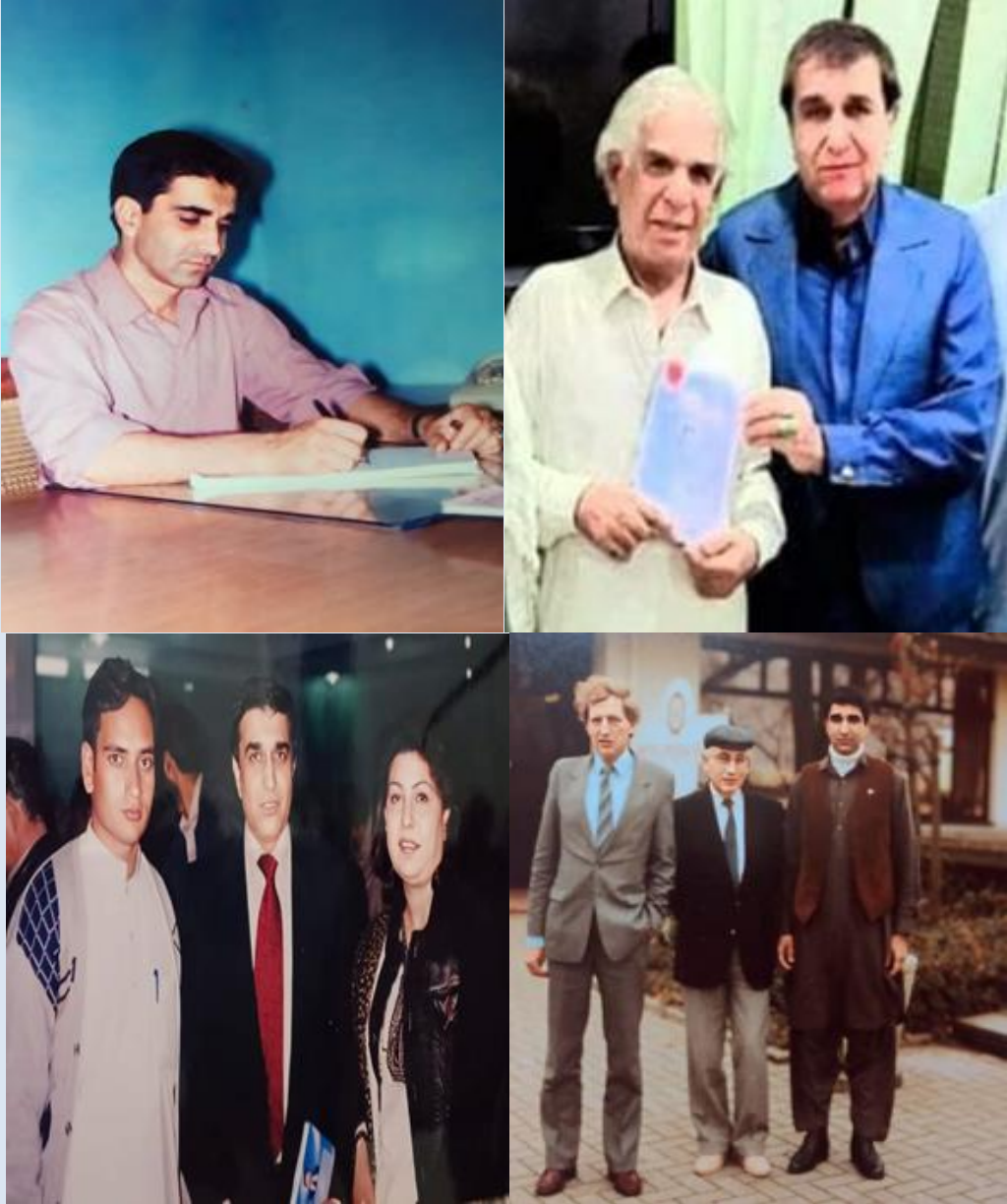
ویسپا کلب کوئٹہ کے بلوچستان چیمپین
Scootorists گل باغ میں آغا گل کے ہمراہ

05:53
09/01/30
BE·1109
05:53
09/02/09
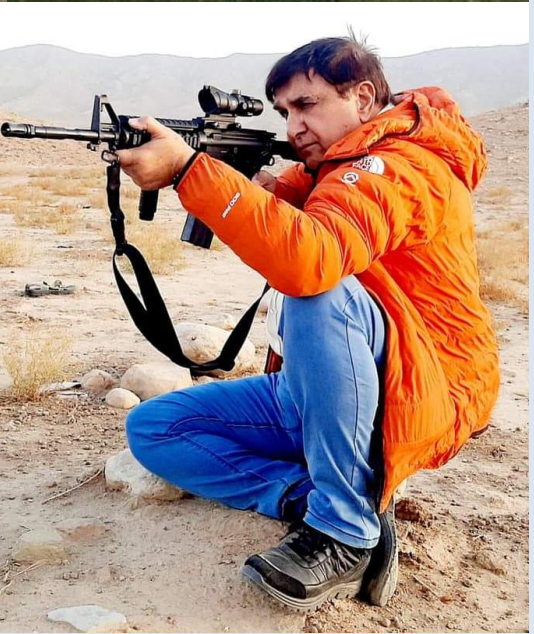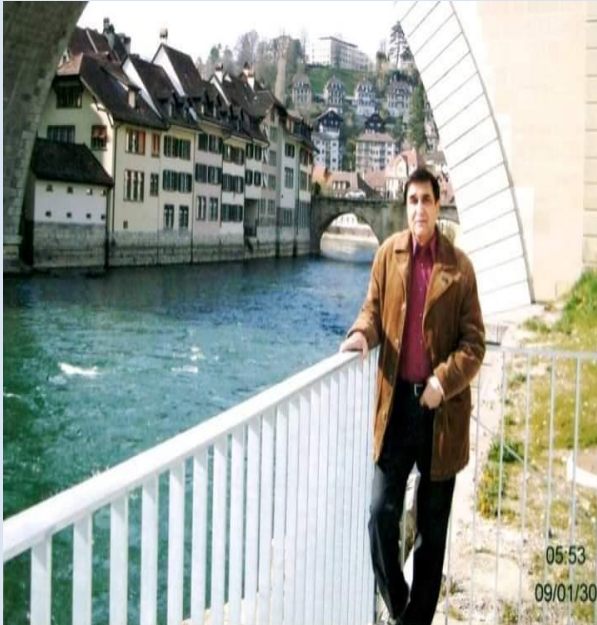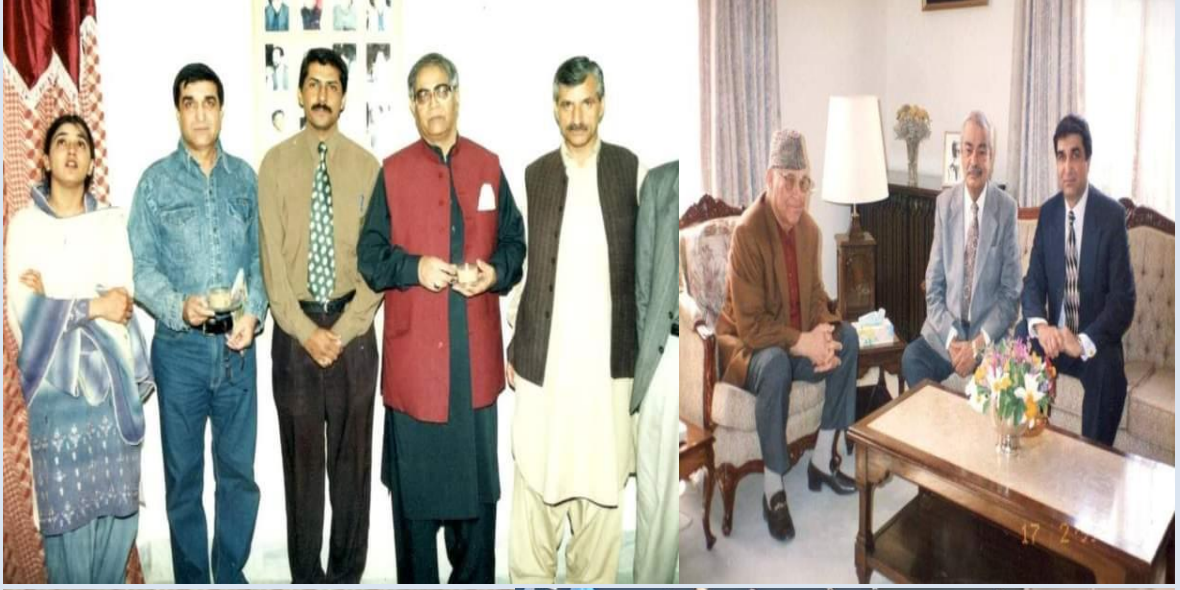
GRACE
آغا گل جی ایف سی چرچ کی کرسمس تقریب میں خطاب
کرتے ہوئے۔
22 دسمبر 2024
Agha Gul

نام: فضل الرحمٰن

قلمی نام: فضل تنہا غرشین

پیشہ: لکچرار اردو، کالجز ہائیر اینڈ ٹیکنیکل ایجوکیشن بلوچستان

جائے تعیناتی: گورنمنٹ بوائز ڈگری کالج پشین

مستقل پتہ: کلی غرشینان، رود ملازئی، کاریزات، ضلع پشین

رابطہ نمبر: 03303732667

میل نمبر: fazal.gharshin@gmail.com

نذرِ آغا گل

ہے وہ مثالِ عزم و محبت کی انتہا
جو کر سکا نہ کوئی، وہ آغا نے کر دکھایا
نوخیز امیدوں کے شجر وہ لگا گیا
ویراں دلوں میں بھی وہ امیدیں جگا گیا
فکر و عمل، یقیں سبھی ان میں سما گئے
وہ باغبانِ علم ہو کے سب پہ چھا گئے
جو بات لکھ دی اُس نے، وہ تلوار بن گئی
دنیائے ظلم و جور میں دیوار بن گئی
افسانے ان کے سب ہی سناتے ہیں
آج کلیہ تخت و تاج والے لرزتے ہیں
آج کلوہ ہاتھ میں سوال کی شمشیر لایا ہے
وہ اپنی بات میں نئی تاثیر لایا ہے
ہر لفظ جو لکھا ہے، وہ خنجر کا وار ہے
اور وہ قلم کا لشکری، شعلہ شعار ہے

سید عبد الوحید فانیؔ